FEBRUARY
2025

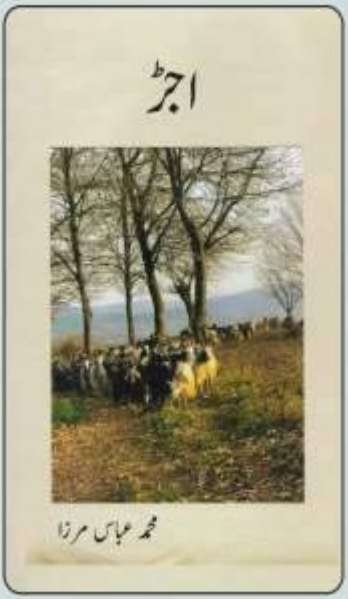

اجڑ
محمد عباس مرزا

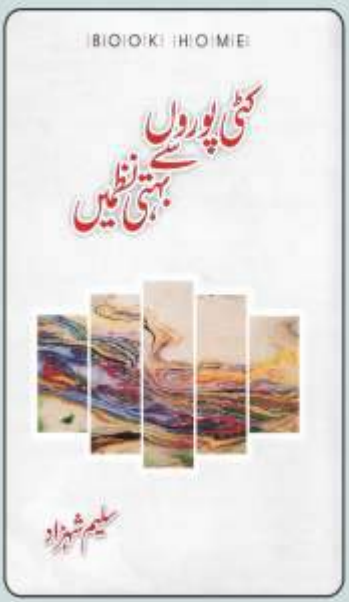

BOOK HOME
کٹی پوروں سے بہتی نظمیں
سلیم شہزاد

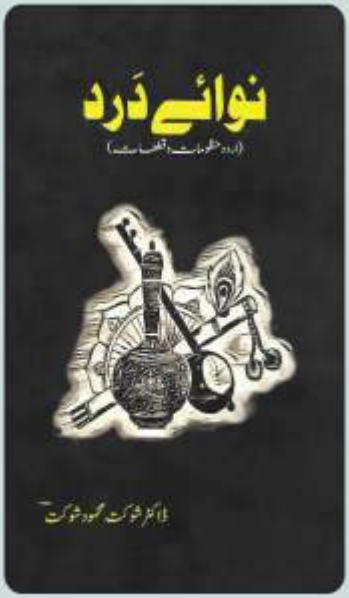

نوائے درد
ڈاکٹر شوکت محمود شوکت

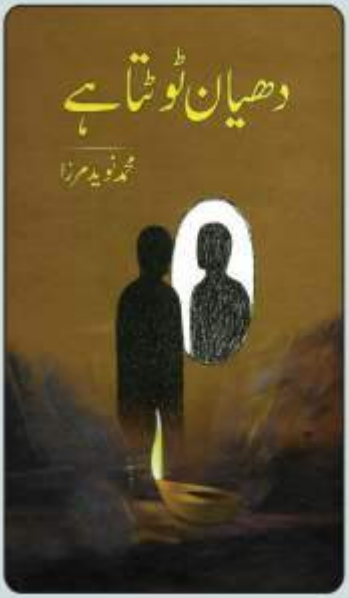

دھیان ٹوٹتا ہے
محمد نوید مرزا

آج کسی پر ذرّہ برابر ظلم نہ ہوگا

لو! وہی فیصلے کا دن آیا
لوگ کتنے ہرے درختوں کو
روز چولہوں میں جھونک دیتے تھے
مجرمو! یہ وہی جہنم ہے
تم نے ہر شام جس کو جھٹلایا

لو! وہی فیصلے کا دن آیا
کوئی ہم پنجروں کو زندہ کرے

کوئی ان ہڈیوں کو لب دے دے
ہم کہ ہر دن کی طرح بے بس ہیں

آج پھر بے کسوں کا والی ہے
جس کو ہر شام ہم نے جھٹلایا
لو! وہی فیصلے کا دن آیا

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 36363300-7
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5606565 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ بیاض لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 33 - فروری 2025 - شمارہ نمبر: 2

مدیر اعلیٰ: عمران منظور

مدیر: نعمان منظور

مجلس ادارت	اعجاز رضوی	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور
A/c Title: Monthly BAYYAZ
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور-53700

فون: 3-37513000-42-92 فیکس: 37512517-42-92

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ www.trackntie.com BAYAZ

عمران منظور (پبلشر) ولو پرنٹرز ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر ملتان روڈ سید اطہر شہید روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	آصف ثاقب، حسن عسکری کاظمی، فیض رسول فیضان، دلشاد احمد	7 تا 10
2	نعت	جلیل عالی، محمد یٰسین قمر، سید ریاض حسین زیدی، نسیم سحر خاور اعجاز، نورین طلعت عروبہ، اعجاز دانش، علی رضا احمد علی رضا، نوید صادق	11 تا 20
3	عقیدت	مرزا آصف رسول، طاہر منیر مرزا	21 تا 23
4	رباعیات	گلزار بخاری	24
5	مزاحیہ قطعات	خاور اعجاز	25
6	مضامین	جلیل عالی، غلام حسین ساجد، حامد یزدانی، نوید صادق دردانہ نوشین خان، سید مدثر شاہ، ماریہ سلیم فیصل زمان چشتی، طاہر شبیر، تنویر قاضی، نوید عاجل انجم جاوید، افتخار الحق، نصرت نسیم، قمر زمان، ارشد محمود ارشد	26 تا 106
7	پنجاب کے گمشدہ کردار	اعجاز رضوی	107 تا 109
8	غزلیں	خالد احمد، آصف ثاقب، حسن عسکری کاظمی، جلیل عالی اعجاز کنور راجہ، محسن اسرار، یعقوب پرواز، گلزار بخاری، خالد علیم نثار ترابی، سید ریاض حسین زیدی، خاور اعجاز، نسیم سحر راحت سرحدی، شریف ساجد، شاہین عباس، افتخار شاہد	110 تا 197

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
8	غزلیں	ذکی طارق، اجمل اعجاز، اقبال سروبہ، رانا سعید دوشی، طالب انصاری، اکرم ناصر، منظر اعجاز، عقیل رحمانی، سید قاسم جلال، اقبال ناظر، احمد جلیل، مسعود احمد، علمدار حسین، رخشندہ نوید، صائمہ آفتاب، مرزا سکندر بیگ، انصر حسن، ہمایوں پرویز شاہد، ریاض ندیم نیازی، احمد سجاد بابر، عرفان صادق، آفتاب خان، خالدہ انور، راجہ عبدالقیوم، ظہور چوہان، نائلہ راٹھور، شوکت محمود شوکت، رضا اللہ حیدر، افروز رضوی، اصغر علی بلوچ، نبیل احمد نبیل، اکرم جاذب، کیفی قلندر، محمد اشرف کمال، عابد معروف مغل، اعجاز روشن، بشیر احمد حبیب، نوید عاجز، عاصم بخاری، مظہر امام، تصور اقبال، خالد ندیم شانی، افتخار شوکت، اظہر کمال، ساغر حضور پوری، ثمینہ سید، وسیم جیران، شبیر نازش، اعجاز دانش، محمد اشفاق بیگ، صائمہ اسحاق، عزیز عادل، امتیاز انجم، اسد رضا سحر، جیا قریشی، ممتحسن جامی، عقیل عباس، عابد رضا، شفقت حسین شفق، تنویر قاضی، افضل ہزاروی، حماد ریاض، آغر ندیم سحر، دلشاد احمد، عبدالرؤف زین، سرفراز عارض، غضنفر مہدی، امجد خان تجوانہ، زبیر فاروق العرشی، جویریہ کاظم، عنبرین خان، کومل جوئیہ، محمد اکرام رضوی	110 تا 197
9	طنز و مزاح/خاکے	سیدہ آمنہ ریاض، نور کمال شاہ، اعجاز رضوی	198 تا 206
10	افسانے	کلیم خارجی، نیلما ناہید درانی، زیب اذکار حسین، عمار نعیمی، فاطمہ روا غوری، محمد کلیم	207 تا 223
11	مائکرو فکشن	محمد اویس، بابر امین ابر	224 تا 225
12	نظمیں	صفدر صدیق رضی، منظور ثاقب، جاوید قاسم، ذکی طارق، محمد انیس انصاری، سید طاہر شیرازی، رخشندہ نوید، نائلہ راٹھور، فیض رسول فیضان، فیصل زمان چشتی، شوکت محمود شوکت، امجد بابر، وسیم جیران، زاہد خان، زبیر خیالی، ظہور احمد مخلص	226 تا 241

حمد

خدا سے حوصلہ پاکر، خدا کی حمد لکھتے ہیں
ہم اس کا عندیہ پاکر خدا کی حمد لکھتے ہیں

ہمارے عکس کی کرنوں کی تحریری کرامت ہے
جمالِ آئنہ پاکر خدا کی حمد لکھتے ہیں

ہمارے آنسوؤں کی بزم قائم اور دائم ہے
شبینہ سلسلہ پاکر خدا کی حمد لکھتے ہیں

دعا کی روشنائی کی لکھائی ہے ہتھیلی پر
قلم کا معجزہ پاکر خدا کی حمد لکھتے ہیں

اہم اپنی عاجزی ثاقب خدا کے سامنے رکھیں
خدا سے مرتبہ پاکر خدا کی حمد لکھتے ہیں

آصف ثاقب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تو ہی حافظ ہے میرے بچوں کا
میرے شہروں کا میرے قصبوں کا

حمد

حاکمِ ہر دو جہاں ، مالکُ المُلکِ بقا
مجھ سے بے نام سے کیا ہوگی بھلا حمد و ثنا

میں تو اک بندۂ ناچیز ہوں آیا ہے خیال
سجدہ واجب ہے کہاں اور کو، پھر اس کے سوا

کون ہے جس نے مرے حال پہ رکھی ہے نظر
وہی معبود مرا جس نے سنی میری دعا

کس نے صحرا میں بہاروں کو دیا اِذنِ خرام
صبح دم کس کو چلی ڈھونڈنے پھر تازہ ہوا

اس کی ہستی کے اشارے پہ یہ دیکھا میں نے
گدگداتے ہوئے کلیوں کو چلی بادِ صبا

اَن گنت نعمتیں دیتا ہے وہ دنیا میں ہمیں
کس سے ممکن ہے کرے حقِ اطاعت بھی ادا

رزق دیتا ہے وہ ہر شخص کو بن مانگے حسن
وہ کہ ہر حال میں سنتا ہے غریبوں کی نوا

حسن عسکری کاظمی

حمد

جب انا کو فنا کرے کوئی
حمدِ ذاتِ خدا کرے کوئی

بخش دینا ہے شیوۂ رحمت
فکر کیوں حشر کا کرے کوئی

مصطفیٰؐ کا کہا کرے کوئی
وحدۂ کی ثنا کرے کوئی

سُن کے احوالِ سرمدؒ و منصورؒ
قصدِ وحدت ذرا کرے کوئی

یاد کر کے حدیثِ طور و کلیمؑ
دید کی التجا کرے کوئی

معرفت کا سفر بجا فیضان
پہلے اپنا پتہ کرے کوئی

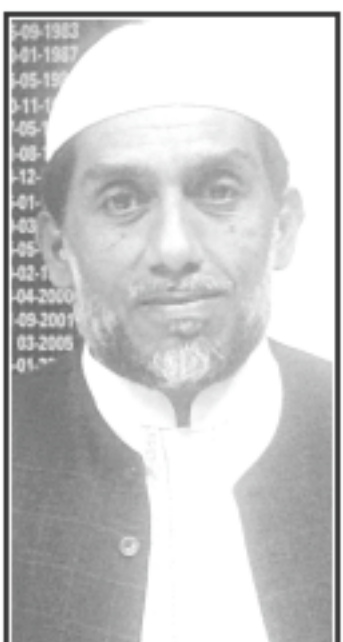

ہاتھ لگتا ہے گوہرِ مقصود
آنسوؤں سے دُعا کرے کوئی

عکس کیا ہے، دُوئی کا مظہر ہے
آئنے کو خفا کرے کوئی

خود قضا بھی ادا نما ٹھہرے
اِس طرح حق ادا کرے کوئی

جاں امانت ہے یارِ جانی کی
دل نہ مانے تو کیا کرے کوئی

سانس رقصاں ہے وجد میں دھڑکن
کس طرح حوصلہ کرے کوئی

فیض رسول فیضان

حمد

جلوہ ساماں ہیں تری مہتاب پرتابانیاں
ہے اُدھر کی بانٹتا سب کو اِدھر تابانیاں

کر رہا ہوں حمد تیری اس شبِ بے نُور میں
کر رہی ہیں ہر ساعت پر اثر تابانیاں

گو نہیں رکھتا تُو خد و خال اپنے اے خدا
ذرے ذرے میں نمایاں ہیں مگر تابانیاں

شور منبر ہو یا وہ خاموشیٔ محراب ہو
کر رہی ہیں ہر طرف دل پر اثر تابانیاں

ایک ہی کُن کا نہیں میں پا سکا اب تک سراغ
کیا یہ کم ہیں ایک مشتِ خاک پر تابانیاں

حلقۂ موجود و ناموجود میں بس تُو ہی تُو
چار سُو جلوہ نما ہیں سر بہ سر تابانیاں

پھر تری دلشاد کیوں کر نہ کرے حمد و ثنا
جب کریں حدِ نظر دل پر اثر تابانیاں

دلشاد احمد

نعتؐ

ہر دور اُسؐ کے عہد کا ممنون ہو گیا
اُسؐ سے ہٹا جو وقت وہ مطعون ہو گیا

جو جو قدم اٹھا گئی سیرت سرِ حیات
نظمِ فلاح و خیر کا قانون ہو گیا

ظاہر ہوئیں جو اُسوۂ حسنہ کی برکتیں
کفار کے لیے کوئی افسون ہو گیا

دنیا کے سارے جاہ و حشم ہیچ ہو گئے
دل جب سے اُسؐ کی یاد کا مسکون ہو گیا

جب بھی پڑھی سنی کوئی بات اُسؐ کی، یوں لگا
رقصاں رگوں میں جیسے نیا خون ہو گیا

جس روز پہلی نعت کہی، مجھ پہ یہ کھلا
فن آشنائے جوہرِ مکنون ہو گیا

آئے ہیں جب سے ایک حصار نگاہ میں
دل ہر بلائے دہر سے مامون ہو گیا

عالی اٹھایا حمدِ خدا کے لیے قلم
لکھا تو پہلے نعت کا مضمون ہو گیا

جلیل عالی

نعتؐ

ہر وقت ہے سوچ مدینے میں ہر آن مواجہ پر دل ہے
اک آپؐ کی الفت اور چاہت اس عمرِ رواں کا حاصل ہے

اُس ماہِ مبیں سے نسبت ہے جس وقت سے میرے لفظوں کو
ہر حرف میں نور کا پرتو ہے ہر زیر زبر میں جھلمل ہے

والشمس وہی، والنجم وہی، یٰسین وہی، طٰہٰ بھی وہی
وہ جن کی باتیں ہر لب پر، وہ جن کا ٹھکانہ دل دل ہے

ہاتھوں میں لئے کشکولِ ثنا میں بھی ہوں کھڑا اک کونے میں
جس قاسمِ نعمت کے در پر ہر شاہ و گدا ہی سائل ہے

اے زائرِ طیبہ! ٹھہر ذرا اے شوقِ حرم! محتاط روی
اک سمت بقیعِ غرقد ہے، باب جبریلؑ مقابل ہے

دھڑکن دھڑکن ہے صلِّ علیٰ، ہر تارِ نفس اللہ ھُو ہے
ہوں وجد و سرور کے رستے پر یہ سامنے کون سی منزل ہے

ہے سارے جہانوں کی رحمت محبوبؐ دو عالم کی ہستی
گر غور کریں سارا عالم طیبہ کے نگر میں شامل ہے

طابہ، طیبہ، برّہ، طُوبیٰ اسمائے مبارک ہیں جس کے
اس بستی کا ذرّہ ذرّہ دیکھو تو نور شمائل ہے

ہے اُنؐ کا ایک اک لفظ قمر حکمت کا علم کا سرمایہ
جو اُنؐ کا ہے فرمودہ وہ حق جو اس سے جدا ہے باطل ہے

محمد یٰسین قمر

نعتؐ

تاریخِ کن فکاں کا روشن ترین باب
عزت مآبؐ شانِ رسالت کی آب و تاب

قرآں بشکلِ نطقِ پیمبر ہوا عطا
بس آپؐ ہی کی ذات مبارک ہے الکتاب

خوفِ خدا کی فرماں روائی ہے چار سو
خوفِ جہاں سے ہو گیا جو کلی اجتناب

انسانیت کو راہِ شرافت نصیب ہے
نافع حضورؐ! آپؐ کا اسوہ ہے بے حساب

بزمِ جہاں سے تیرگی کافور ہو گئی
طیبہ کی وادیوں میں ابھر آیا آفتاب

تعلیمِ خیر آپؐ کی بندہ نواز ہے
رشد آفریں سیرتِ اطہر کا ہر نصاب

انسانیت کی شاخِ تمنا ہری ہوئی
جو بے ثمر تھے پیڑ ہوئے خوب بہرہ یاب

جو بھی رسولِؐ پاک کے دامن کو تھام لے
تا زیست ہر مقام پہ ہو گا وہ کامیاب

میں ہوں ریاض آپؐ کی نسبت سے ارجمند
خوش بوئے نعتِ پاک سے ہوں خوب عطر یاب

سید ریاض حسین زیدی

نعتؐ

جب سے بنا لیا ہے درود و ثنا شِعار
صد شُکر، مَیں بھی ہونے لگا مصطفیٰ شعار

ہم آپؐ کے غلام، اِطاعت گزار ہیں
سب نعت گو ہیں آپ کے آقاؐ، وفا شِعار

نِسبت جو قلبی رکھتے ہیں آلِ رسولؐ سے
پیدائشی وہ ہوتے ہیں صبر و رضا شِعار

حُبِ رسولؐ جب سے رچی میری روح میں
صلِّ علیٰ کا وِرد ہوا ہے مِرا شِعار

چلتی ہے چھُو کے اُنؐ کے وجودِ لطیف سے
طیبہ میں تو ہَوا بھی لگے ہے صبا شِعار!

اب اَور کوئی صنفِ سخن کھینچتی نہیں
جب سے ہوا ہے منقبتِ مصطفیٰ شِعار

یہ کہہ کے مجھ کو ہاتفِ غیبی نے داد دی
اب نعت گوئی ہونے لگی ہے ترا شِعار!

سوچا جو خوش نصیب بہتّر شہید تھے
میں بھی خوشی سے ہونے لگا کربلا شعار

آئے قیامِ غارِ حرا سے جو لَوٹ کر
آقاؐ بذاتِ خود بھی لگے ہیں حرا شِعار

جس کو رسولِ پاکؐ کی مِدحت نصیب ہو
لاریب ہونے لگتا ہے وہ بھی خدا شِعار

ادراک جن کو منبعِ نُورِ حرا کا تھا
وہ سارے فطرتاً ہی ہوئے تھے ضیا شِعار

اے کاش ہم بھی پیروئ مصطفیٰ کریں
دشمن پہ رحم کرنا رہا آپؐ کا شِعار

جو خوش نصیب انؐ کی اِرادت میں آ گئے
مٹّی تھے، اور ہونے لگے کیمیا شعار

اک پل میں ان کی ہونے لگی قلب ماہیت
انؐ کی پناہ میں جونہی آئے جفا شِعار

وہ آپؐ ہی کے نقشِ قدم پر چلا حضورؐ
جو عہد بھی نسیم ہوا ارتقا شِعار

جب سے نسیم نعتِ نبیؐ کا شرف ملا
کیا خوب ہو گیا ہے ترا مرحبا، شِعار!

نسیمِ سحر

نعتؐ

کُھلا ہدایتِ ابدی کا باب ، کیا کہنا
طلوعِ مہرِ رسالت مآبؐ ، کیا کہنا

ہزار گُل ہوں ، گُلِ ہاشمیؐ کی بات ہے اور
مہک سبھی کی ہے ، لیکن ، گلاب ، کیا کہنا

مِٹی چُنی ہُوئی دُنیا کی مہربانیوں میں
وہ آپؐ کا کرمِ بے حساب ، کیا کہنا

لِیا جو نامِ محمدؐ تو اُس سے سات گُنا
گُناہ گاروں کو پہنچا ثواب ، کیا کہنا

حضورؐ آپ کو ہو گی خبر خموشوں کی
حضورؐ آپ سے حالِ خراب کیا کہنا

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس کی تکہت رنگ سے قریہ قریہ گل آثار
کس کے چراغ کی لو سے جھلمل جھلمل طاق بہار

نعتؐ

سچ کہوں، یُوں بھی خیالات میں آ جاتے ہیں
اشک، موتی کی طرح نعت میں آ جاتے ہیں

آپؐ کے واسطے "تم" "تو" ہے ہمیں سوئے ادب
دل سلگتا ہے تو جذبات میں آ جاتے ہیں

آنکھ بھر آئے اگر شعب ابی طالب میں
پھر سے گلزارِ مواخات میں آ جاتے ہیں

قدر و قیمت جسے معلوم ہے گریہ والی
اشک اُس آنکھ میں بے بات میں آ جاتے ہیں

فرخی پاتے ہیں جونہی اے مری خُلد زمیں
ہم اِسی شوق ملاقات میں آ جاتے ہیں

ایسے لگتے ہیں حضوریؐ کے بلاوے ہر بار
جیسے بادل ہوں جو برسات میں آ جاتے ہیں

خواب میں گنبدِ خضرا کے تلے مسند پر
آنکھ کھُلتی ہے تو اوقات میں آ جاتے ہیں

نورین طلعت عروبہ

نعتؐ

جس شخص نے لو میرے آقا سے لگائی ہے
اس شخص کا دنیا میں ہر شخص فدائی ہے

اس جیسا دو عالم میں خوش بخت نہیں کوئی
جس شخص کی قسمت میں طیبہ کی گدائی ہے

یہ دینِ متیں کیا ہے سیرت ہے محمد کی
قرآن ہے کیا ان کی بس مدح سرائی ہے

معراج نبی یارو قصہ ہے محبت کا
قوسین کی قربت ہے اور جلوہ نمائی ہے

دن رات ترے گھر میں محفل ہے فرشتوں کی
جس دن سے حلیمہ تو سرکار کو لائی ہے

اک بار جو جالی کو سینے سے لگا آیا
دنیا کی فضا اس کو پھر راس نہ آئی ہے

جس قبر پہ ہر لمحے ہے رقص کناں خوشبو
یہ مائی حلیمہ ہے سرکار کی دائی ہے

جس سمت بھی جاتا ہوں کہتے ہیں غلام ان کا
مجھ کو ہے غرور اتنا بس یہ ہی بڑائی ہے

یہ نور بشر جھگڑے سب چھوڑ دے اے دانش
آجا در آقا پر اس میں ہی بھلائی ہے

اعجاز دانش

نعتؐ

مرتبہ جس نے نبیؐ پاک کا پہچانہ ہے
اس کا انداز زمانے سے جداگانہ ہے

ان کی ہر بات ہے پر نور ہدایت والی
دل کی ہستی کو اسی نور سے چمکانا ہے

سارے آئینوں سے بڑھ کر ہے یہ آئینہ مرا
دل مرا میرے نبی پاک کا کاشانہ ہے

روح کرتی ہے مری خانۂ کعبہ کا طواف
دل مگر گنبدِ خضریٰ ہی کا پروانہ ہے

دستِ ساقی کا وہاں فیضِ کرم ہے جاری
اس کا دیوانہ بھی فرزانوں کا فرزانہ ہے

کر کے آتا ہے مدینے کا جو درشن احمد
دل کے گوشے میں اسے آپ نے ٹھہرانا ہے

علی رضا احمد

نعتؐ

فضائے شہرِ رسالت یقیں میں روشن ہے
نبیؐ کا سایہء رحمت یقیں میں روشن ہے

مری نگاہ سے گزرا ہے جب سے گنبدِ سبز
کمالِ حُسنِ بصارت یقیں میں روشن ہے

مرے نصیب پر نازاں ہے اس لیے دنیا
حضور! آپؐ کی چاہت یقیں میں روشن ہے

میں راہِ زیست میں کس طرح لڑکھڑا پاؤں
مرے رسولؐ کی سیرت یقیں میں روشن ہے

اسی لیے تو میں آسودگی میں رہتا ہوں
شہہِ عرب کی اطاعت یقیں میں روشن ہے

علی رضا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تو نے ہر ذرّے کو سورج سے ہم آہنگ کیا
تو نے ہر قطرے میں اک بحر کی وسعت لکھی

نعتؐ

دل سے ہو اِک سفر مدینے کو
اور کیا چاہیے ہے جینے کو

اک نظر میں بدل دیا سب کچھ
کون پہنچا ہے اس قرینے کو

آ گئے آپ ورنہ میرے حضور!
ڈوب جانا تھا اِس سفینے کو

دھڑکنوں میں سمیٹ لوں، اے کاش!
لوگ خوشبو کہیں پسینے کو

اے مری پیاس! ایک در کے طفیل
آب کوثر ملے گا پینے کو

بادباں بن گیا جو حرف ثنا
آسرا مل گیا سفینے کو

یوں دھڑکنے لگی ہے ان کی یاد
جیسے دل مل گیا ہو سینے کو

راستہ مل گیا ہے طیبہ کا
پا لیا ہے فلک کے زینے کو

نعت گوئی کا فن، نوید اور تم!
چھو رہے ہو کس آبگینے کو

نوید صادق

عقیدت

نہ دیکھوں میں اگر اُن کی رضا کا آئینہ
تو کیا؟ مرے خد و خالِ وِلا کا آئینہ

اِسی میں دیکھ کے خود کو سنوارنا ہے مجھے
جو مصطفیٰؐ سے ملا تزکیہ کا آئینہ

متاعِ فکر و عمل اُسوۂ محمدؐ ہے
جہاں میں ہے یہی حُسنِ ادا کا آئینہ

اِسے سپُردِ محمدؐ کروں تو میرے لیے
ہے میرا نفس بھی ذاتِ خدا کا آئینہ

ہو کاش حُبِّ رسولؐ اب بھی سُرخرو جیسے
ہے خونِ آلِ عبا کربلا کا آئینہ

کتاب و سنت و عترت کا نور ہو نہ اگر
دکھائی دے کسے؟ رُشد و ھُدیٰ کا آئینہ

ہے بارگاہِ پیمبرؐ میں اُس سا کون دھنی؟
جسے عطا ہوا صدق و صفا کا آئینہ

دکھائی دے گا ہر اک دل کو اُس میں حُسن اپنا
بنے جو صلِ علیٰ سے وفا کا آئینہ

نہ گونجے صلِ علیٰ سے گر اپنا گنبدِ جاں
کہاں سے لائیے جا کے ندا کا آئینہ؟

جو غم کہ ہیں پسِ ہستی بھلا نہ دے ہم کو
عقیدتوں کے نمود و ریا کا آئینہ

انا کے جتنے بھی پتھر ہوں یوں نہ ہوگا کبھی
کہ ٹوٹے نُصرتِ حق کی ضیا کا آئینہ

ہے فیضِ نسبتِ خورشیدِ عشقِ مصطفوی
چمک رہا ہے جو میری نوا کا آئینہ

خود اپنے حال سے محبوبِ حق کی شان تلک
سخن ہے کیا؟ نگہِ نارسا کا آئینہ

فدائے خاکِ مدینہ ہزاروں تاج کہ وہ
ہے نقشِ پائے شہِ انبیا کا آئینہ

ہے مومن آئینۂ مومن اُس کی رحمت سے
ہے جس کا دیں شرف و تزکیہ کا آئینہ

کرم ہے رشتوں کی حُرمت پہ اُس مدثر کا
دیا ہے جس نے حجاب و حیا کا آئینہ

جو زیست کو وہ مزمل تمدن اوڑھائے
وہی ہے سب کے لیے ارتقا کا آئینہ

یہ اتباعِ پیمبرؐ وہ بندگی رب کی
ہے کفر و شرک سے طبعِ رہا کا آئینہ

یہ آئینے میں گُہر خاک راہ جلوہ سہی
ہے آئینہ مگر اُن کی عطا کا آئینہ

سوائے صل علی کل من علیھا فان
کہ اُن کی شان ہے سرِّ بقا کا آئینہ

وہ جانِ لوح و قلم ہیں کہ شانِ کُن فیکون
ہیں وہ جہاں وہیں قدر و قضا کا آئینہ

وہاں پہ چہرۂ امکاں کو یاس کیوں دھندلائے
جہاں ہو ذکرِ محمدؐ رجا کا آئینہ

لکھا ادب سے مظفر نے جیسے "بابِ حرم"
مرا سخن بھی ہو صلِ علیٰ کا آئینہ

ہو ننگ کیوں وہ معیشت کہ جس کے پاس رہے
شہرِ مدینہ کے جود و سخا کا آئینہ

کوئی نہ داغ رُخِ زیست پہ رہے کہ اگر
فضائے طیبہ ہو صبح و مسا کا آئینہ

ہے شاہد آج بھی اقراء و ربک الاکرم
ہے لوحِ طور سے بڑھ کے حرا کا آئینہ

کسی اندھیرے میں ہوگا نہیں سیاہ کبھی
رسولِ نور کے مدحت سرا کا آئینہ

ہے آصف! اِس سے بھی آرائشِ جمالِ نظر
میں دیکھتا رہوں اُن کی ثنا کا آئینہ

مرزا آصف رسول

عقیدت

یہ اڑتی چڑیا، یہ گاتی کوئل، یہ پھول غنچے، یہ باغ سارے
کریم مولا ترے ثنا گو ہیں مرغ ماہی، مراغ سارے

یہ چاند تارے، بھڑکتا سورج، یہ کہکشاؤں کے سرپہ جھرمٹ
یہ کس کی لو سے ہے دنیا روشن ترے جلائے چراغ سارے

کہیں پہاڑوں کی راج نیتی، کہیں سمندر کی تہہ نشینی
یہ اعلیٰ قامت، یہ پستیاں سب خدائی کے ہیں سراغ سارے

جو قلب و سینہ سیاہ تر ہے، جو پاپی من کی غلاظتیں ہیں
جو تو مٹائے اے کن کے مالک تو مٹ ہی جائیں گے داغ سارے

ہے عشق کی یہ سلامتی کہ میں جان اپنی نثار کر دوں
جو سر سجدہ ہے سرفروشی یہ لذتوں کے ایاغ سارے

طاہر منیر مرزا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تو واحد ضارب سارے سکوں کا
تو ہی وارث ہے سارے ورثوں کا

رباعیات

کی رب نے فزوں عزت و آنِ حیدر
پھر کیوں نہ مثالی لگے شانِ حیدر
ہمت کا شجاعت کا جواں مردی کا
ہے سب سے بڑا تمغہ نشانِ حیدر

.....

ٹھہرا ہے ولی قبلہ ارباب سخن
کہتا ہے وہی محرم ارباب سخن
در تازہ مضامین کا نہیں بند کبھی
تا روز قیامت ہے کھلا باب سخن

.....

قلب اسکا سخن کے لئے قالب ٹھہرا
وہ جدتِ افکار کا طالب ٹھہرا
مغلوب اسے کر نہیں پایا کوئی
غالب اسداللہ تھا غالب ہی رہا

.....

یا برقِ بلا گرتی ہے رعد آتا ہے
مشکل سے کوئی موسمِ سعد آتا ہے
جلدی سے نہیں بخت سنورتے دیکھے
اقبال بڑی دیر کے بعد آتا ہے

.....

وابستہ ہیں بھٹکی ہوئی اقلیم کے ساتھ
خواہش ہے کہ محشور ہوں تعظیم کے ساتھ
نمرود کے پیرو بھی دعا مانگتے ہیں
ہو خاتمہ بالخیر براہیم کے ساتھ

بے شک ہمیں صابر بھی کہا جاتا ہے
حد تک ہی مگر جبر سہا جاتا ہے
مرگِ سگِ دنیا جو شہادت ٹھہرے
خاموش کہاں ان سے رہا جاتا ہے

.....

اے راحتِ جاں خوب سہی عید کا چاند
لیکن ترا ہم سر ہے کہاں عید کا چاند
ملنا ترا ہر وقت خوشی دیتا ہے
اک دن ہے مسرت کا نشاں عید کا چاند

.....

کیا تھا وہ سفر سیرو سفر کی خاطر
بلکہ تھا وہی خیرو خبر کی خاطر
معراجِ محمد سے یہی درس ملا
گردوں ہوا تسخیر بشر کی خاطر

.....

خود کو نہ کبھی کرم کتابی سمجھا
ہستی کو محبت کا نصابی سمجھا
بھولا نا کبھی خاک نشینی اقبال
دیتا ہے قرار بو تُرابی خود کو

گلزار بخاری

مزاحیہ قطعات

شاعر

دھیرے دھیرے شوق کا منظر کھُل
مُنہ کھُلا ، آنکھیں کھُلیں پھر سَر کھُلا
شعر تو تقریب میں ہی کھُل گئے
صاحبِ اشعار چائے پر کھُلا

سفر بخیر

جو مِلا کھا لیا اور شُکر کِیا
کھُل کے سستا لِیا اور شُکر کِیا
چل پڑے چچو کی مَلیاں سے بخیر
آ گئے پھالیہ اور شُکر کِیا

تغیر

اِک زمانہ اِس قدر سستا بھی گذرا ہے یہاں
دو روپے کے دال چاول دو روپے کا گھی لیا
اور اَب یہ حال ہے مہنگائی کے ہاتھوں میاں
جھڑکیاں بیوی کی کھائیں اور غصہ پی لیا

ایک بٹا چار مسلمان

کوئی قہاری نہ غفاری نہ جبروتی ہُوں
اَب فقط نام کا ہی پرتوِ قدوسی ہُوں
ایک عنصر بڑی مشکل سے بچا ہے لیکن
ایک چوتھائی مسلمان تو مَیں پھر بھی ہُوں

نتیجہ

اِک ترش اور دو کوئی نمکین گولیاں
اِک وقت مجھ کو کھانا پڑیں تین گولیاں
بیمار ہو کے شعر کہے مَیں نے جس قدر
اُن میں تھے بیشتر کے مضامین گولیاں

خاور اعجاز

''غلط پارکنگ'' کا ایک نوٹس

شاعر دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو مارکیٹ ویلیو کی وجہ سے مزاحیہ شاعری اختیار کرتے ہیں اور مارکیٹ اکانومی ان کو مزاحیہ شاعر بناتی ہے ۔ انھیں لاکھ ہم آواز دیتے رہیں، ان کا حال میر کے اس شعر والا ہوتا ہے کہ:

تری گلی میں گیا سو گیا نہ بولا پھر
مَیں میر میر کر اس کو بہت پکار رہا

.....

اس طرح کے دو چار سنجیدہ شاعروں کو ہم نے بھی بڑا روکا اور آخر آخر انھوں نے یہ نعرہ لگایا کہ بھائی اِدھر مارکیٹ ہے۔ دوسرے وہ ہیں جو اپنی افتادِ طبع کی وجہ سے مزاحیہ شاعر بنتے ہیں۔ جن کی طبیعت چیزوں کے اندر کی پیراڈاکسیکل صورت دیکھتی ہے۔ ان کی نگاہ تضادات پر جاتی ہے اور اس میں سے وہ مزاح پیدا کرتے ہیں۔ ابھی الیاس بابر صاحب نے مزاح کی کچھ تعریفیں بتائی ہیں۔ کسی بھی فن کی جو ڈیفینیشن ہوتی ہے وہ گرو کرتی رہتی ہے اور گرو کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ جو پہلے بندے نے بات کہی تھی وہ غلط ہوگئی اور جو اس میں ایڈ اپ ہوا وہ اصل ہے۔ اصل میں ڈائمنشنز اتنی ہوتی ہیں، پراپرٹیز اتنی ہوتی ہیں کسی چیز کی کہ کسی کی نگاہ اس کی ایک پراپرٹی کی طرف چلی جاتی ہے کسی کی دوسری کی طرف چلی جاتی ہے۔ جس زمانے میں ہم نے ایم اے اردو میں داخلہ لیا ان دنوں ڈاکٹر وزیر آغا کی تحقیقی کتاب ''اردو ادب میں طنز و مزاح'' کا بہت چرچا تھا۔ اس میں بھی مزاح کی بہت سی تعریفیں بیان کی گئی تھیں۔ ہمارے استاد بھی ہمیں بتاتے تھے کہ جہاں کنٹراڈکشن ہوتی ہے اس سے مزاح پیدا ہوتا ہے مگر ہر کنٹراڈکشن مزاحیہ نہیں ہوتی۔ مزاح میں تضاد ہوتا ہے لیکن ہر تضاد میں مزاح نہیں ہوتا۔ مثال دیتے تھے کہ ایک بہت لمبا آدمی اور اس کے ساتھ ایک بالکل ٹھگنی سی خاتون جا رہی ہو تو اس پر کوئی پھبتی کسے کہ گلی ڈنڈا جا رہا ہے تو اس سے مزاح پیدا ہو گا۔ اب دیکھیں بعض اوقات مزاح جو ہوتا ہے وہ بہت زیادہ سنجیدگی اور مضحک صورتحال کے سنگم پر واقع ہوتا ہے۔ مثلاً دنیا کا جو سب سے مختصر افسانہ ہے اسے آپ مزاحیہ ادب میں بھی شامل کر سکتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ ایک سواری نے دوسری سے پوچھا کہ تم دکھوں پر یقین رکھتے ہو تو سامنے والا آدمی غائب ہو گیا۔ یہ اتنی سنجیدہ کہانی ہے لیکن اس کے اندر مزاح بھی موجود ہے۔ مزاح بری صورت حال سے پیدا ہونے والے غصے کو نیوٹرلائز کرنے کے کام بھی آتا ہے مگر اس کا مثبت پہلو یہ ہے کہ مزاح بہت زیادہ بڑھی

جلیل عالی

ہوئی ٹینشن اور ذہنی فشار کو دور کرنے کا کام بھی کرتا ہے اسی لیے کہتے ہیں کہ جس تہذیب میں مزاح نہیں ہوتا وہ صحتمند تہذیب نہیں رہتی۔ جو معاشرہ وٹ سے خالی ہو وہ یبوست زدہ ہو جاتا ہے۔ جہاں تک مزاح کے غلط استعمال کا تعلق ہے۔ صرف مزاح نہیں، معاشرے میں ہر وہ چیز جو لوگوں کے لیے اہمیت رکھتی ہے ایکسپلائٹ اسے ایکسپلائٹ کرتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ جاگیرداروں نے میراثی رکھے ہوتے ہیں۔ وہ لوگوں کے اور ان کے درمیان جو ظالم اور مظلوم کا رشتہ ہوتا ہے اس کو اپنے چٹکلوں سے نیوٹرلائز کر دیتے ہیں۔ ایک اپنائیت کا احساس پیدا کر دیتے ہیں۔ جاگیردار کا بھی مضحکہ اڑا کر ردِعمل کی شدت کو کم کر دیتے ہیں۔ یوں بات آئی گئی ہو جاتی ہے۔ اس سے بہترین کام مارشل لا ڈکٹیٹر ضیاء الحق نے لیا تھا۔ اس نے ففٹی ففٹی کے نام سے ایک ٹی وی پروگرام چلوایا تھا جس میں حکومت کے مظالم اور لوگوں کی مظلومیت کے درمیان جو کشیدگی تھی اس کو نیوٹرلائز کر دیا جاتا تھا۔ جس چیز کو ایکسپلائٹ کیا جائے وہ چیز غلط نہیں ہو جاتی۔ کیونکہ ہر اہم چیز ایکسپلائٹ ہو جاتی ہے۔ مذہب بھی ایکسپلائٹ ہوتا ہے، احساسِ جمال بھی ایکسپلائٹ ہوتا ہے، سیکس بھی ایکسپلائٹ ہوتی ہے، معیشت بھی ایکسپلائٹ ہوتی ہے۔ ہر وہ جو اہمیت رکھتی ہے وہ ایکسپلائٹ ہوتی ہے۔ تو یہ دو نقطۂ نظر تھے جو میں نے آپ کے سامنے عرض کیے۔ اب آپ دیکھیں کہ کسی وقت کوئی مزاحیہ انداز میں کہی ہوئی بات آپ کے ساتھ چمٹ کر رہ جاتی ہے۔ اس کا تجزیہ کرنا پڑے گا۔ اس سے پتا چلے گا کہ جسے ہم سنجیدہ مزاح کہتے ہیں اس میں اور پھکڑ پن میں کیا فرق ہے۔ جب سنجیدگی میں ڈوب کر دردمندی سے مزاح لکھا جاتا ہے تو اس میں کوئی ایسی جہت نمایاں ہوتی ہے کہ وہ آپ کے ساتھ چمٹ کر رہ جاتا ہے اور اپ کے اندر اسی طرح سے تخلیقی ادب والا تسلسلِ ابلاغ پیدا کر دیتا ہے۔ آپ کے دل و دماغ میں اس کے مختلف پہلوؤں کی تفہیم کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ تو یہ ادبی اور تنقیدی لحاظ سے مزاح ایک لطیف شکل ہوتی ہے۔ اس میں ادبیت کی بڑی سطحیں ہیں۔ میں نے ان کی کتاب بارے تھوڑی سی تحقیق کی ان کی تو یہ پتا چلا کہ ان کے بیشتر قطعات جو ہیں ان کا تعلق ہمارے ادب کے متعلقات کے ساتھ ہے۔ شعر کے ساتھ، ادبی تقریبات کے ساتھ، استاد کے ساتھ، شاعروں کے ساتھ اور کتاب کے ساتھ۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں یہاں صرف دو چار قطعات کے عنوان ہی پڑھ دیتا ہوں۔

مقالہ، شاعری کا عالمی دن ، دقیقِ ممتنع، تقریبِ رونمائی، استاد شاعر کا شکوہ، شعر کشی، حلقہ ارباب ذوق، حسبِ غزل، صدرِ تقریب، روحِ اقبال سے بصد معذرت، داد کا نتیجہ، عشق، استاد جی، جدید شعر، حالِ دل، ہجرِ جاناں، فیس بک کی داد، داغ کے مصرع میں تصرف کے ساتھ، مبتدی ارسطو، دیوانے دو۔

تو دیکھیں یہ میں نے وہ عنوان نکالے جو شاعری کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ خوشی اس بات کی ہوتی ہے کہ وہ جو سکہ چلتا ہے آج کل بہت کہ یا تو بیوی کو ہدف بناتے ہیں یا مہنگائی کو۔ تیسرا شارٹ کٹ مارنے والے ٹوٹے چلانے شروع کر دیتے ہیں مگر اس کتاب میں اس طرح کی آپ کو کوئی چیز نہیں ملے گی۔ پتہ چلے گا کہ ایک ذمہ دار، ایک پڑھا لکھا اور ایک انٹلیکچول، دانشمندانہ نظر

رکھنے والا شاعر مزاحیہ قطعات لکھ رہا ہے۔ ایک بات اور کہ جب قدرت بہت زیادہ کسی پر خوش ہوتی ہے تو اسے انعام کے طور پر کچھ ایسا عطا کر دیتی ہے جو اس کا خاصہ بن جاتا ہے۔ اردو کی سنجیدہ شاعری میں بھی اور مزاحیہ شاعری میں بھی، نثر میں بھی شاعری میں بھی کوئی کیریکٹر کسی کی پہچان بن جائے، جیسے چچا چھکن ہے تو یہ بہت بڑی بات ہے۔ ان کی پہلی کتاب میں بشیراں کا کردار ان کی پہچان بنا۔ یعنی وہ اس کتاب کا خاصہ تھا اور دوسری کتاب کا جواب آئی ہے اس کا خاصہ وہ طویل نظم ہے جس کا بہت ذکر ہوا۔ اس انداز کی نظم کا سٹرکچر ان کو کیسے فلیش ہوا۔ اس میں انھوں نے اکیس کریکٹر شامل کیے۔ ہر کردار کی الگ پہچان کروانا اس کے شعبے کے لحاظ سے خصوصیات اور نفسیاتی پہلو نمایاں کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔ میں اگر یہ کہوں کہ اس کو آپ ایک ناول کی شکل میں بھی پڑھ سکتے ہیں تو غلط نہیں ہوگا۔ میں نے جو اشعار اور قطعات منتخب کیے تھے ان میں سے اکثر دوستوں نے سنا دیے ہیں۔ میں مزاح کی لطافت کے حوالے سے جو ایک نکتہ بیان کر رہا تھا اس میں کچھ اپنے لیے بھی موقع نکال رہا ہوں، میں جو نکتہ بیان کر رہا تھا نا کہ مزاح کی ایک سطح ایسی ہے کہ جس میں مختصر انداز میں اتنی بڑی بات کہہ دی جاتی ہے کہ جو آپ کے احساس کا حصہ بن جاتی ہے۔ اس نکتے کے حوالے سے میں آپ کو اپنی ایک چھوٹی سی نظم سناتا ہوں۔ میں نے کہا نا اپنے لیے بھی گنجائش نکالنی چاہیے۔ نظم کا عنوان ہے

''ایک لطیفہ کافی ہے''

اونچے سے اونچے
پربت کی چوٹی کا تکبر
بادل کے ایک چھوٹے سے
ٹکڑے کی مار ہے
اک بے نام احساس کی جھلمل
چڑھتا سورج منصوبوں کے
گیند اوھیٹر کے رکھ دیتی ہے
پوری حقیقت سوچ قلاوے میں لینے کا زعم
خیالِ خام
بڑے بڑے نظریوں والے بھاری فلسفے
عام سے ایک لطیفے کا بھی
ترچھا وار نہیں سہہ سکتے

اب میں آپ کو ان کا ایک سنجیدہ قطعہ سناتا ہوں:

ہے اب تو اونٹ بھی حیران ہم پہ
ہماری کوئی کل سیدھی نہیں ہے
کروڑوں زندہ لاشوں کے وطن میں
کوئی بھی دوسرا ایدھی نہیں ہے

.....

مجھے سمجھ نہیں آتی کہ اس میں مزاح کس جگہ ہے۔ اور مزاحیہ مجموعے میں اس کا کیا جواز ہے؟

اب آخر پر آپ لوگوں کو ایک کمینی سی خوشی میں شریک کرنے کے لیے ایک آدھ بات۔ میں کچھ کتابوں بارے کہہ کرتا ہوں کہ اس کتاب میں بعض کتابت کی غلطیاں ہیں مگر کچھ کتابت کی غلطیاں نہیں ہیں۔ تو انھوں نے بھی ایک جگہ خورونوش کو خوردونوش لکھا ہے۔ عزیز فیصل صاحب پتہ چل گیا ہے نا۔ وہ اسے غلط العوام کا نام دے رہے ہیں۔ حالانکہ انہیں یہ کہنا چاہیے تھا کہ یہ مزاحیہ کلام کا مصرع ہے!!

(عزیز فیصل کے مزاحیہ شعری مجموعے ''غلط پارکنگ'' کی تقریبِ رونمائی میں صدارتی گفتگو)

☆☆☆☆☆

میں اور باغ ..... منظر اعجاز

منظر اعجاز کی ''میں اور باغ'' میں دو رنگ، پیلا اور کاسنی بار بار اپنی جھلک دکھاتے ہیں، کبھی لباس پر کھل کر، کبھی منظر سے ہویدا ہو کر اور کبھی گھر کو سہارا دیتی دیواروں کا لبادہ بن کر، تو احساس ہوتا ہے کہ منظر اعجاز کا خلق کردہ باغ جامد نہیں متحرک ہے اور اس کی نسبت شاعر کی ذات سے اس قدر گہری ہے کہ وہ تیس برس گزرنے کے باوجود بھی اپنے آپ کو اس کے سحر سے نکال نہیں پایا۔ اس نسبت میں عجیب طرح کی طلسمی موانست ہے جو شاعر کو بار بار اپنے حصار میں لیتی اور بساط حرف بچھانے پر آمادہ کرتی ہے اور ایک نامیاتی وجود بن کر ''میں اور باغ'' میں اٹھلاتی پھرتی ہے۔

میں نے ''میں اور باغ'' کو لطف لے لے کر پڑھا۔ اس لیے کہ یہ کسی فکری، لسانی، فلسفائی یا اُستادانہ شعری تجربے کی پوتھی نہیں، پروین شاکر کی ''خوشبو'' کی طرح نوخیز محبت کی کتھا ہے۔ لمس سے محروم مگر جذبے اور بے ریا چاہت کی دلربائی سے مغلوب۔ اپنے ہونے کا احساس دلانے کی سعی کرتی اور کسی اور کے ہونے کی اہمیت کو فزوں کرتی ہوئی۔ احتیاط، جھجک اور حیا کے سلکی اُلجھاوے میں جکڑی مگر بے بسی اور یاسیت کے رنج سے آزاد۔ چوٹ کھائے بچے کی محجوب ہنسی جیسی، ویسی ہی جیسی صبح کی پہلی کرن اور محبت کی پہلی چنگاری کو ہونا چاہیے۔

''جن دنوں کاسنی تھی ہوا
ہم نے
پیلے دوپٹے کے بارے میں
جو کچھ لکھا
وہ کسی کو سنایا نہیں
دید کے سبز موسم میں
پلکوں تلے
کون سے پھول کھلتے تھے
کتنے ستارے دمکتے تھے
ہم نے کسی کو بتایا نہیں
لوگ کہتے تھے سُننے سے اظہار بہتر ہے

غلام حسین ساجد

پر آزمایا نہیں
صورت اشک شانے پہ سر رکھ کے
غم کو بہایا نہیں
یہ الگ بات ہے
پردہ داری کے اس کھیل میں
کچھ بھی پایا نہیں'' (جن دنوں کا سنی تھی ہوا)

''میں اور باغ'' تین حصّوں میں منقسم ہے۔
1- دائرے سرکتے ہیں (ذرا بعد کی نظمیں)
2- لفظ کے سُوت سے (غزلیں) 3- کا سنی تھی ہوا (ذرا پہلے کی نظمیں)۔ اس کتاب کا پہلا اور تیسرا حصہ نظموں اور دوسرا یا منجھلا حصہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ ذرا پہلے کی نظموں کا مستقر یونیورسٹی کیمپس ہے، کتاب، کلاس روم، کینٹین، کوریڈور اور آتے جاتے راستوں پر ہمہماتی زندگی، ہوشیار مگر بے پرواہی اور لاابالی پن کا کھیل کھیلتی لڑکیاں اور اُن کی کشش سے بندھے مگر زبان پر خاموشی کی مہر لگائے لڑکے۔ اپنے اپنے دائروں میں حرکت کرتے مگر اجرام فلکی کی طرح اپنے فاصلے اور غیر کی کشش سے گریز کرنے کی روایت کو برقرار رکھے ہوئے کہ آگ شعلہ بنے نہ اتنی مدھم ہو کہ دھواں دینے لگے۔ اس لیے اس حصے میں ویسی ہی آنچ ہے جیسے جوانی سے جھوجھتے بدن میں ہونی چاہیے۔ یہ نظمیں برحق اور بے ساختہ ہیں اور منظر اعجاز نے اچھا کیا کہ ان کو رمز و کنایہ کے سائے میں لانے سے گریز کیا ورنہ یہ بوڑھی ہو جاتیں اور ان کے نوخیز بدن کی کسک جاتی رہتی۔

منظر اعجاز کی غزلیں نوعیت کے اعتبار سے ''نئی غزل'' کی روایت سے قریب ہیں۔ کہیں۔ کہیں مجھے محمد علوی اور کہیں عادل منصوری اور رئیس فروغ یاد آئے مگر فکری مماثلت کی بنیاد پر نہیں لسانی اور مصرعوں کی ساخت کی بنیاد پر۔ ان غزلوں کو پڑھتے ہوئے احساس ہوا کہ منظر اعجاز نے مصرعے کی نحوی ترتیب پر زور دینے کے بجائے خیال کی فوری ترسیل کو فوقیت دی ہے اور قافیے کے غیر روایتی استعمال سے ندرت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کوشش بڑی حد تک کامیاب ہونے کے باوجود وہ مجھے غزل میں کھل کر سانس لیتے محسوس نہیں ہوئے۔ لگتا ہے جیسے وہ غزل کی جمالیات سے نا مطمئن نہیں تو اُس سے ہم آہنگ بھی نہیں ہیں۔ اُن کی غزل کے الگ اور عمدہ ہونے میں کوئی شُبہ نہیں مگر وہ ایک خاص طرح کی ناملائمیت اور کھُردرا پن لیے ہے، کچھ کچھ اختر احسن کی ''کیا نگر میں لنکا'' جیسا۔ بے ساختگی سے زیادہ ساخت پر آنکھیں ٹکانے کا تاثر دیتی ہوئیں:

چاند، میں اور باغ فجر جُدا
صبح صد کار کے ڈرائے سے
یار میں اور عدو میں یہ تفاوت کم ہے
تیر بھی جائے مگر ساتھ تسلی جائے!
بند کھڑکی کی گلی کی سمت کُھلی
یوں لگا غنچہء دیوار کھلا

ایک تیری ہی کمی ہے خواب میں
دھوپ ہو، سردی ہو، ہم ہوں، چائے ہو
خواب کا ریشم دھرا رہ جاتا ہے
نیند آتی ہے تو بس آ جاتی ہے
حرف سونے ہی نہ دیتے تھے مجھے
میں نوشتہ برُخِ دیوار تھا

.....

مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ منظر اعجاز اچھی غزل کہنے پر قادر نہیں۔ اس کی غزل کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ وہ غزل کی روایت اور رواں منظر نامے سے بخوبی آگاہ ہے اور یہی آگاہی اسے اُس سے الگ اور کچھ نیا کرنے پر اُکساتی ہے سو وہ تجربے کی راہ پر چل نکلتا ہے۔ میں خود تجربہ کرتے رہنے پر ایمان رکھتا ہوں اس لیے جانتا ہوں کہ بعض اوقات یہ عمل سرابی صورت بنا کر چلنے والے کی راہ کھوٹی کرنے کا سبب بنتا ہے سو اسے احتیاط اور گہرے فنی شعور کے ساتھ اپنانا اور ترک کرنا چاہیے۔

کتاب کا پہلا حصہ ''دائرے سر کتے ہیں'' ذرا بعد کی یعنی تازہ نظموں پر مشتمل ہے۔ یہ نظمیں گہرے مشاہدے اور سماجی شعور کے تال میل سے وجود میں آئی ہیں اور موجود کی شعری روایت سے جُوی ہیں۔ منظر اعجاز نے یہ نظمیں کسی ماہر زرباف کی طرح بُنی ہیں۔ ان نظموں کی بنیاد ہمارے اردگرد بل کہ خود شاعر کے اردگرد کی دُنیا پر ہے، جس میں بظاہر کچھ بھی انوکھا اور نیا نہیں مگر شاعر نے اپنے کمال کی طلسمی چھڑی سے چُھو کر نیا اور انوکھا بنا دیا ہے۔ اس قدر کہ بالکل سامنے کی چیز اپنی پہچان کھوئے بغیر کسی طلسمی دُنیا کی شے محسوس ہونے لگتی ہے۔

ایک نظم دیکھیں:-

کھڑا ہے باغ کے کونے میں سر اُٹھائے ہوئے
نہ گل بدوشی کی خصلت نہ بارآور ہے
نہ کوئی رنگ اچھوتے ہیں، کوئی جادو ہے
نہ کوئی روح کو مہکانے والی خوشبو ہے
خزاں بہار سبھی رُت میں ایک رنگ کا ہے
یہ کم پسند پرندوں کو اور گلہری کو
نہ سبز رُت کو نہ پیلی کو اور سنہری کو
نہ اس سے باغ کو چھاؤں گھنی میسّر ہے
نہ چوب خشک کوئی لکڑیوں میں افسر ہے
مگر یہ خاص ہے اوروں سے سربلند ہے یہ
مگس کو شہد بنانا ہو تو پسند ہے یہ (انٹرورٹ)

.....

''میں اور باغ'' کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ منظر اعجاز کس سلیقے سے بڑے ہوئے ہیں۔ کیمپس کی جمالیات سے کیمپنگ کی اقتصادیات تک کا سفر شعر کے ذریعے ایک مسلسل ارتقا کی صورت میں کرنا کوئی معمولی کارنامہ نہیں اور آج ہم یہاں انہیں اسی کارنامے کی داد دینے کے لیے یکجا ہوئے ہیں۔

(میں اور باغ کی تقریب میں صدارتی گفتگو)

☆☆☆☆☆

اپنے پرانے دوست زاہد مسعود کی یاد میں

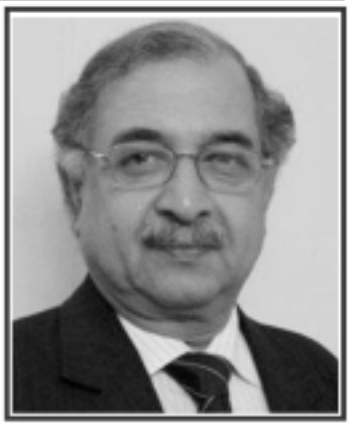

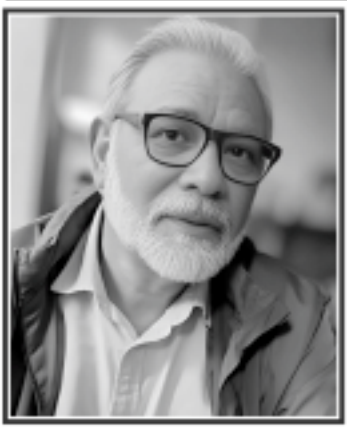

''اوئے، حامد یزدانی! کہیہ حال اے تیرا؟ پچھانیا ای کہ نئیں؟ میں زاہد مسعود۔۔۔''

یہ درست ہے کہ یہ آواز میں نے مدتوں بعد اُس روز اچانک سُنی تھی کہ بیچ میں لاہور اور ٹورانٹو کا ہزاروں کلو میٹر کا فاصلہ اور مہ و سال کی کچھ دہائیاں آن پڑی تھیں مگر زندگی سے بھرپور وہ آواز اور ایک شریر مسکراہٹ میں لپٹا لہجہ میں کیوں کر بھول سکتا تھا۔ چنانچہ ان کے خاموش ہونے پر میں نے زاہد مسعود کو بتایا کہ میں انھیں فوراً پہچان گیا تھا تو بتانے لگے کہ وہ ان دنوں اپنی بیٹی سے ملنے کینیڈا آئے ہوئے ہیں اور یہ میرا نمبر انھیں ہمارے مشترکہ لاہوری دوست طاہر اسلم گورا نے دیا تھا جو اس وقت بھی ان کے ساتھ تھے۔ میں نے عرض کیا کہ میں اس وقت امریکا کے سفر پر ہوں اور فیملی کے ساتھ کار دوڑاتا ہوا پین سلوینیا عبور کر رہا ہوں تاکہ جلد از جلد اپنی منزل ورجینیا پہنچ جاؤں مگر کیا کروں کہ راستے کے خوب صورت مناظر سفر کا دورانیہ طویل کیے دے رہے ہیں۔ گویا میں رُک رُک کر چل رہا ہوں۔

میری بات سُن کر انھوں نے وہی قہقہہ بلند کیا جو گویا ان کا 'ٹریڈ مارک' بن گیا تھا۔

''تے واپس کدوں آئیں گا؟'' قہقہے کے دوران ہی انھوں نے پنجابی ہی میں استفسار

حامد یزدانی

کیا تھا- وہ لاہوری دوستوں کے ساتھ بالعموم پنجابی ہی میں بات کرتے تھے-ہاں، حلقۂ ارباب ذوق اور دیگر ادبی تنظیموں کے اجلاسوں کی اور بات ہے کہ ان میں تو گفت گو اردو میں کی جاتی تھی- پنجابی ادبی سنگت اور ادبی پروار میں وہ دل کش پنجابی بولتے ہوئے بھی دیکھے جاتے تھے-

''چند روز میں لوٹ آؤں گا اور آتے ہی ملاقات کی صورت بناؤں گا-'' ان کے سوال کے جواب میں میں نے کہا تھا-

''چل فیر ٹھیک اے- توں چلا گڈی- ملاقات ہوئے گی-'' انھوں نے کہا اور خدا حافظ اور رب راکھا کے ساتھ ہمارا مختصر مکالمہ مکمل ہوگیا- ہماری کار اب ریاست ورجینیا کے سرسبز درختوں سے اٹی ایک ڈھلوانی سڑک پر دوڑ رہی تھی اور میرا ذہن یادوں کی ست رنگی وادی میں اتر رہا تھا-

.....

''اوئے، حامد یزدانی - کیہڑے ڈیپارٹمنٹ وچ داخلہ ہویا اے تیرا یونی ورسٹی وچ؟''

پاک ٹی ہاؤس میں داخل ہوتے ہی زاہد مسعود نے سیدھا بائیں دیوار کے ساتھ صوفے والے آخری میز کا رُخ کیا تھا جہاں ہم نوجوان ایک دوسرے میں ''دھنسے'' بیٹھے تھے- وہاں پہنچتے ہی انھوں نے مجھ سے پوچھا تھا- اور میرا دھیما سا جواب تھا:

''سوشیالوجی میں''-

''اوئے یار تے شرما کیوں رہیا ایں- سوشیالوجی ڈیپارٹمنٹ- نیو کیمپس- واہ- فیر تے موجاں ہوگئیاں-- مطلب توں اوس پرستان دا باشندہ بن گیا ایں- لاء کالج کیہڑا دُور اے- میں آواں گا تینوں ملن لئی-''

انھوں نے مسکراتے ہوئے یہ کہا- پھر ساتھ والے میز کی جانب مُڑے جہاں عباس نجمی کسی بات یا شعر پر اقبال ساجد کے ساتھ الجھ رہے تھے- زاہد نے جلدی سے عباس نجمی کا ہاتھ پکڑا اور ڈاکٹر سہیل احمد خان، انیس ناگی اور انتظار حسین کے میزوں کے پاس سے گزرتے ہوئے انھیں ٹی ہاؤس سے باہر لے گئے اور میں اپنے دوستوں مختار حسین کھرل، علی اصغر عباس، عباس تابش، غضنفر علی ندیم، اظہر غوری، وسیم گوہر اور طارق کامران کیساتھ وہیں بیٹھا رہا- ضیا الحسن، آفتاب حسین اور امجد طفیل درمیان والے میز پر پروفیسر محمد خالد، ابرار احمد اور غلام حسین ساجد صاحبان کے ساتھ محوِ گفت گو تھے-

اور پھر اگلے روز زاہد واقعی سوشیالوجی ڈیپارٹمنٹ آ گئے۔ بظاہر مجھ سے ملنے مگر دراصل ''پرستان'' کی سیر کرنے۔ پھر گویا یہ ان کا معمول بن گیا۔ وہ ہر دوسرے تیسرے روز آتے۔ ہم کینے ٹیریا میں چائے پیتے، گپ شپ کرتے اور مل کر ہنستے۔ سچی بات یہ ہے کہ ہنستے تو بھائی زاہد مسعود ہی تھے میں تو اُن دنوں اتنا شرمیلا تھا کہ ہنسنے کی بات پر بھی جھینپ جھینپ جاتا تھا اور وہ اس صورت حال سے بہت لطف اٹھاتے۔ ان ملاقاتوں میں نہ وہ کبھی اپنی شاعری مجھے سناتے تھے اور نہ کبھی مجھے 'دعوت سخن سرائی' دیتے تھے۔ میں ان کی شاعری 'ماہ نو'، 'فنون' اور ایسے ہی دوسرے معیاری ادبی جرائد میں پڑھا کرتا تھا یا پھر حلقہ کے اجلاس میں سنا کرتا تھا جب وہ تنقید کے لیے کچھ پیش کرتے تھے۔

زاہد عمر میں مجھ سے کچھ بڑے تھے۔ سو، میری ان کی دوستی میں میری جانب سے احترام کا عنصر شامل رہا۔ لیکن وہ بالکل بے تکلف تھے۔ کچھ بھی پوچھ لیتے تھے۔ کچھ بھی کہہ دیتے تھے، کسی بھی جھجک کے بغیر۔ ٹی ہاؤس میں اگرچہ وہ ہر کسی سے نہ ملتے تھے مگر ان کی میل ملاقات بہت تھی۔ ان کا حلقۂ احباب کشور ناہید صاحبہ اور جناب عطاالحق قاسمی سے لے کر زاہد حسن اور مجھ سے کم گو اور کم دیدہ لکھاری تک پھیلا ہوا تھا۔

.....

میں ابھی یونی ورسٹی میں پڑھ ہی رہا تھا کہ یاروں نے حلقہ ارباب ذوق کے انتخابات میں کھڑا کر دیا۔ میں سخت گھبرایا ہوا تھا کیوں کہ مجھے رُکن بنے ابھی ایک ہی سال تو ہوا تھا۔ مگر یہ علی اصغر عباس اور عباس تابش ہی کی ہمت تھی کہ انھوں نے ناہید شاہد کے ساتھ مل کر نہ صرف زاہد مسعود، ڈاکٹر سعادت سعید، پروفیسر محمد خالد، خالد احمد، سراج منیر، عالم خان، ارشاد حسین اور مبارک احمد کی حمایت میرے لیے حاصل کی بل کہ بھرپور انتخابی مہم بھی چلائی - اعجاز رضوی ، طارق کامران، مختار حسین کھرل، اصغر عابد، ضیاالحسن، امجد طفیل سمیت سبھی دوستوں نے میرا ساتھ دیا۔ مجھے ہر شام زاہد مسعود سمیت ان دوستوں اور بزرگوں کو اپنے دن بھر کی انتخابی کارروائیوں کی رپورٹ دینا پڑتی تھی اور اپنی 'نالائقی' پر محبت اور نصیحت بھری ڈانٹ بھی کھانا پڑتی تھی۔ کیسے پُرخلوص لوگ تھے! اب بھی

ان سب کی محبتوں کے بارے میں سوچتا ہوں تو روح سرشار ہو جاتی ہے۔

.....

مجھے یاد ہے کہ ایک روز انتخابی مہم کے دوران میں جب میں رسالہ 'ماہ نو' کے دفتر قائم نقوی صاحب سے مل چکا تو اپنے دوست ڈاکٹر جاوید انور کے ساتھ رسالہ کی ایڈیٹر کشور ناہید صاحبہ کے کمرے میں بھی جا پہنچا۔ وہ سامنے ایک بڑے میز کے پیچھے بیٹھی تھیں۔ ان کے بائیں جانب زاہد مسعود بیٹھے تھے۔ ہم نے سلام کیا۔ زاہد مسکرائے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ میں ووٹ مانگنے آیا ہوں۔ کشور صاحبہ نے کٹے ہوئے امرود کی ایک طشتری ہمارے سامنے کر دی۔

''کھاؤ، ہم بھی یہی کھا رہے ہیں۔ امرود صحت کے لیے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ کیوں ڈاکٹر''۔ کشور صاحبہ نے ڈاکٹر جاوید انور کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

جاوید نے فوراً کہا:

''جی، طبی طور پر اس کے کئی فائدے بتائے جاتے ہیں اور آج ہمیں زاہد مسعود کی صحت کا راز بھی پتہ چل ہی گیا۔''

اس پر کمرے میں ملا جلا قہقہہ گونج اٹھا۔ ظاہر ہے اس میں زاہد مسعود کا قہقہہ سب سے جان دار اور 'دیرپا' تھا۔

.....

اگلے روز طے شدہ پروگرام کے مطابق میں انتخابی مہم پر ریڈیو پاکستان پہنچا تو زاہد مسعود سے پھر ملاقات ہوگئی۔ وہ ارشاد بھائی کے کمرے میں ناہید شاہد کے ساتھ بیٹھے تھے۔ خوش گپیاں ہوئیں۔ حلقہ کی باتیں چلیں۔ ٹی ہاؤس کی گرما گرم ادبی چپقلشوں پر تبصرے ہوئے، اسرار زیدی صاحب کے بدلتے سیاسی پینتروں کا تجزیہ کیا گیا اور ریڈیو کینٹین کی چائے کے ساتھ ایک دوسرے کی خوب چغلیاں کھائی گئیں۔

''زاہد صاحب، کل آپ سے کہاں ملاقات ہو رہی ہے؟ آپ خود ہی بتا دیں۔ کیوں کہ میرے پہنچنے سے پہلے ہی آپ میری منزل پر پہنچ چکے ہوتے ہیں۔''

اس پر سب کھلکھلا دیئے۔

''گورا کے دفتر میں۔ کل وہیں ملیں گے۔''

زاہد نے کہا۔

جب سے طاہر اسلم گورا نے پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز کے نام سے اشاعتی ادارہ قائم کیا تھا۔ اکثر دوست لکھاری دن میں ایک چکر ادھر کا ضرور لگاتے تھے۔ زاہد

بھی باقاعدگی سے وہاں جاتے تھے۔

.....

جرمنی سے لاہور واپسی پر اسی دفتر میں جب میرے پہلے شعری مجموعہ ''ابھی اک خواب رہتا ہے'' کی تعارفی تقریب منعقد ہوئی جس کی صدارت جناب شہزاد احمد نے کی تھی اس میں بھی زاہد مسعود نے میری شاعری اور شخصیت پر ایک ہلکی پھلکی تحریر پڑھی تھی جس کے بعض جملوں نے محفل کو واقعتاً زعفران زار بنا دیا تھا۔ ظاہر ہے ہم عصری کا حق ادا کرتے ہوئے اس میں انھوں نے مزاح کی آڑ میں مجھ پر طنز کے بھی کچھ ''دوستانہ'' تیر برسائے تھے۔ سب بہت محظوظ ہوئے۔ تقریب کے بعد مجھے ایک طرف لے جا کر پوچھنے لگے:

''کیوں بھئی، حامد یزدانی، کیسا لگا میرا مضمون؟''

میں نے کہا کہ اچھا تھا۔ سبھی داد دے رہے تھے۔ لیکن ان کا اصرار تھا کہ میں اپنی رائے دوں۔ جس پر میں نے مودب انداز میں اپنے احساسات بیان کر دیئے۔ وہ تو مسکراتے رہے مگر مجھے بعد ازاں محسوس ہوا کہ مجھے وضاحت کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ کیوں کہ جب انھیں لگا کہ مضمون کا کچھ حصہ مجھے پسند نہیں آیا تو انھوں نے وہ مضمون غالباً ضائع کر دیا جس کا مجھے افسوس رہا۔

.....

حکومتِ پاکستان کی جانب سے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں صدارتی تمغۂ حسنِ کارکردگی سے نوازا گیا۔ حیرت ہے کہ یہ سرکاری اعزاز بھی ان کے مزاج کو نہ بدل سکا اور وہ پہلے ہی طرح ایک ہنس مکھ انسان اور ایک کھرے دوست رہے۔

.....

یہی باتیں اور یادیں امریکا کے سفر میں میرے ساتھ رہیں اور واپسی پر زاہد سے ملاقات کا اشتیاق اور بھی بڑھ گیا۔ مگر افسوس، جس روز میں واپس کینیڈا پہنچا وہ لاہور کے لیے پرواز کرنے والے تھے اور ائرپورٹ جا رہے تھے۔ فون پر بات ہوئی۔ وعدہ کیا کہ اگلی ملاقات میں اس بار کی تشنگی مٹائیں گے اور دیر تک ساتھ رہیں گے۔

میں نے تاسف بھرے لہجے میں کہا' ٹھیک ہے، ان شاءاللہ۔۔۔

مگر پھر بس سوشل میڈیا پر ہی ایک دوسرے کی تصاویر اور پوسٹس دیکھتے رہے۔

میں یہاں برسوں اور میلوں کے فاصلے پر واقع کرۂ ارض کے شمالی کونے کے برف زار

میں آتے جاتے نت نئے موسموں کے جِلو
میں اپنے پرانے دوستوں کی یادوں بھر
دھوپ میں بھیگا کرتا ہوں۔ اور کروں بھی
تو کیا؟
چشمِ تصور وا کر کے زاہد مسعود سے پوچھتا ہوں
تو وہ مجھے اپنی یہ نظم سنانے لگتے ہیں:
پُرانے دوستوں کے لیے
تم ایسا کرنا
الیش ٹرے میں جمی راکھ کھرچ کر
اس میں آنسو ملانا
اس طرح
جو دھواں پیدا ہوگا
اسے ڈاکیے کے تھیلے میں بھر دینا
میں تمہارے خط کے بھیگے ہوئے حروف
خشک پتوں سے سکھالوں گا
تمہیں یاد ہے
ایک بار ہم نے خودرو پھولوں کو مسل کر
آگ، پانی، ہوا اور مٹی کے رنگ بنائے تھے
مگر وہ کاغذ سے پھسل کر
دیواروں سے چپک گئے
تم ایسا کرنا
وہ رنگ اتار کر اس غبارے والے کو دے دینا
جو چھوٹی چھوٹی نظموں کے عوض غبارے
دینے کی صدا لگاتا ہے
تمہیں یاد ہے
ہم نے کئی بار ایسے نغمے لکھے
جن کی دھنیں
سازوں میں حنوط کر لی گئیں
گویے اور سازندے راگوں کی مرکیاں اپنی
سسکیوں کے ہمراہ
نگلتے ہوئے گلی کا آخری موڑ مڑ گئے
خدا کے لئے تم انکا تعاقب نہ کرنا
ہم آنسوؤں، خود رو پھولوں، دیواروں
سے اترے رنگوں اور گیتوں کو ملا کر
ایک اچھی سی مسکراہٹ بنائیں گے
اور اسے ہونٹوں پر سجائیں گے
ہمیں ابھی کچھ دیر اور زندہ رہنا ہے۔

.....

'ہمیں ابھی کچھ دیر اور زندہ رہنا ہے'---
میں یہ مصرع دہراتا ہوں اور دل کی گہرائی
میں چھپا کوئی محبت سے سرگوشی کرتا ہے
کہ حرف و احساس کو زندگی دینے والا یہ
مخلص دوست اور تازہ کار لکھاری کچھ دیر
نہیں بہت دیر زندہ رہے گا۔ قلب و ذہن
تک پھیلی ہماری یادوں میں اور زمانہ زمانہ
بکھرے اوراقِ ادب میں--- بہت دیر
زندہ رہے گا۔

☆☆☆☆☆

خالد علیم کی رباعیات [ایک مطالعہ]

اردو شاعری میں رباعی کو ایک مشکل صنف شمار کیا جاتا ہے۔ اتنی مشکل کہ آج اس صنف کے لکھنے والے یا اسے رواج دینے والے افراد کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے اور ہیں جو قطعہ اور رباعی میں فرق ہی کو نہ سمجھ پائے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جنھوں نے رباعی کے نام پر ایسی تخلیقات پیش کیں جو عروضی اعتبار سے رباعی ہی کے زمرے میں آتی ہیں لیکن بے رس اور بے مزہ۔ ایسی رباعیات کو پڑھتے ہوئے یہ احساس دامن گیر رہتا ہے کہ یا تو تخلیق کار نے محض اپنے آپ کو رباعی گو کہلوانے کے لیے یہ رباعیات کہی ہیں یا کچھ ایسی صورت احوال دھیان میں در آتی ہے کہ فنِ رباعی کا رعب تخلیق کار پر غالب آ گیا ہے۔ اور یہ تو سیدھی سچی بات ہے کہ اگر فن فنکار پر غالب آ جائے تو۔۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ رباعی کے نام اور فن سے مغلوب ہونے والوں نے بس یوں ہی جانیے کہ چار چار مصرعے کہہ کر کیا کہنے کی کوشش کی ہے، یہ شاید خود ان کے فرشتوں تک کو خبر نہ ہو۔ لیکن جہاں فن کار غالب رہتا ہے وہاں رباعی کی صنف میں بھی تخلیق کے عمدہ نمونے بآسانی تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ میرے خیال میں مجھے اپنی بات کی وضاحت کے لیے چند رباعیات بھی پیش کر دینا چاہئیں:

دنیا سے میل کی ضرورت ہی نہیں
مجھ کو اس کھیل کی ضرورت ہی نہیں
درپیش ہے منزل عدم اے اکبر
اس راہ میں ریل کی ضرورت ہی نہیں
(اکبر الہ آبادی)

تھے پہلے کھلونوں کی طلب میں بیتاب
پھر حسن کے جلووں سے رہے بے خور و خواب
اب ہیں زن و فرزند پہ دل سے قربان
بوڑھے ہیں مگر ہنوز بچے ہیں جناب
(جوش ملیح آبادی)

جہاں اردو شاعری کا دامن مذکورہ بالا دو رباعیات کے مثل مالا مال ہے وہیں دو ایسی رباعیات بھی دیکھتے چلیے جو محض اس لیے کہی گئی لگتی ہیں کہ دکھانا

نوید صادق

مقصود ہے کہ رباعی کہہ سکتے ہیں۔ اور مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ ایسی رباعیات زیادہ تعداد میں کہی گئی ہیں اور اب تک کہی جا رہی ہیں:

افسردہ کے آگے شورِ ہستی ہے ہیچ
ہر فکرِ بلندی اور پستی ہے ہیچ
جو ہیچ پرست ہیں جہاں میں آسی
اُن کے لیے یہ خدا پرستی ہے ہیچ
(عبدالباری آسی)

بے کار نہ چھیڑا کرو بے وقت کا راگ
ڈستا ہے دل و ذہن کو بے وقت کا راگ
خاموشی سے کٹ سکتے ہیں وقت اور سفر
کیوں لب پہ سجا لیتے ہو بے وقت کا راگ
(حافظ کرناٹکی)

رباعی کا آغاز، محمد ارشاد جو بھی ثابت کرتے پھریں، فارسی ہی سے ہوا۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ فارسی زبان میں کہی گئی رباعیات مقدار و معیار ہر دو اعتبار سے افضل ہیں۔ لیکن اردو میں بھی ایک زمانے تک رباعی کا رواج رہا۔ پھر، میرے خیال میں، غزل اور نظم کے جھگڑے میں یہ معصوم صنف کہیں بیچ ہی میں رہ گئی۔

اس پر یہ پروپیگنڈا کہ رباعی گوئی ایک مشکل کام ہے۔ ایسے میں جہاں اچھے خاصے غزل نظم کہنے والے نثری نظم کی طرف مائل ہو گئے تو ان لوگوں کے تو وارے نیارے ہو گئے جو ڈھنگ سے ایک آدھ مصرعہ کہنے سے بھی قاصر تھے۔

لیکن وہ جو رباعی کے آہنگ سے بہ خوبی آگاہ ہیں، جانتے ہیں کہ جتنی سہلتا رباعی میں ہے، شاید ہی کسی اور صنفِ شعر میں ہو۔ اور وہ اپنے جذبات و احساسات کو بذریعہ رباعی دوسروں تک پہنچانا زیادہ سہل سمجھتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں میں عہدِ موجود میں خالد علیم کا نام اہمیت کا حامل ہے۔

اس سے پہلے کہ میں خالد علیم کی رباعیات پر بات کروں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں وضاحت کرتا چلوں کہ میں نے رباعی کو دیگر اصناف سخن کے مقابل سہل کیوں کہا۔ تو قصہ کچھ یوں ہے کہ رباعی کے رائج اوزان چوبیس ہیں۔ بارہ اوزان ہزج اخرب سے اور بارہ ہزج اخرم سے۔ رباعی کے چار مصرعے ہوتے ہیں اور یہ چاروں مصرعے الگ الگ وزن میں ہو سکتے ہیں، شرط صرف یہ ہے کہ ان چوبیس اوزان ہی کو استعمال میں لایا جائے۔ یوں کسی خیال، کسی لفظ کا استعمال رباعی گو کے لیے دشوار نہیں رہتا۔ خالد علیم کی ایک رباعی مع تفصیلِ اوزان دیکھیے:

تخئیل کے لمحات میں آفاق آثار
(مفعول مفاعیل مفاعیلن فاع۔ ہزج مثمن اخرب مکفوف ابتر)
میری تمثال ، میرے تمثال نگار
(مفعول فاعلن مفاعیل فعَول۔۔۔ ہزج مثمن اخرم اشتر مکفوف مجبوب)
یا غرفۂ شب میں اک مہکتا ہوا چاند
(مفعول مفاعلن مفاعیل فعَول۔۔ ہزج مثمن اخرب مقبوض مکفوف مجبوب)
یا پردۂ شام پر دہکتے انگار
(مفعول مفاعلن مفاعیلن فاع۔۔ ہزج مثمن اخرب مقبوض ابتر)

اب ایک نظر ان چاروں مصرعوں کے ارکان کو دیکھیں:

مفعول مفاعیل مفاعیلن فاع
مفعولن فاعلن مفاعیل فعَول
مفعول مفاعلن مفاعیل فعَول
مفعول مفاعلن مفاعیلن فاع

ان چار اوزان کے نام دیکھیے:

۱ - ہزج مثمن اخرب مکفوف ابتر
۲- ہزج مثمن اخرم اشتر مکفوف مجبوب
۳- ہزج مثمن اخرب مقبوض مکفوف مجبوب
۴ - ہزج مثمن اخرب مقبوض ابتر

.....

چاروں مصرعوں میں، چار الگ الگ بحروں کے استعمال کے باوجود، فکری و اسلوبی سطح پر باہم ربط کا اہتمام ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ پیش کردہ رباعی غیر مردف ہے۔ لیکن ان دونوں کے باوجود نہ تو آہنگ میں اجنبیت کا احساس ہوتا ہے اور نہ موضوع کو کوئی ٹھیس پہنچ پائی ہے اور اس کی بنیادی وجہ خالد علیم کی فنِ رباعی سے ایک خاص قسم کی ذہنی ہم آہنگی ہے۔ یہاں خالد علیم کی رباعی گوئی کا عروضی جائزہ مقصود نہیں لیکن ایک بات کا اعلان ضروری ٹھیرتا ہے کہ وہ رباعی کے چوبیس اوزان کو استعمال میں لائے ہیں۔ اور اس قادر الکلامی کی ان کے معاصرین میں مثال نہیں ملتی۔

اردو کی کلاسیکی شاعری میں کم و بیش ہر شاعر نے رباعی کہی، کسی نے تبرکاً کسی نے قدرے زیادہ۔ یہ روایت غالب تک ایک خاص حد تک ہمیں نظر آتی ہے لیکن عبدالغفور نساخ اور اکبر و حالی نے اس صنف کو بطور خاص اپنایا اور بیسویں صدی کے نظم گو شعرا میں جہاں جدید نظمیہ شاعری کا ایک نیا موضوعاتی رُخ نظر آتا ہے وہیں بعض شعرا کو رباعی میں اختصاص حاصل ہے۔ ان میں امجد حیدر آبادی، تلوک چند محروم، جوش ملیح آبادی، یگانہ، فراق گورکھپوری اور موہن لال رواں وغیرہم کے ہاں رباعیات کا متمول ذخیرہ نظر آتا ہے۔ بیسویں صدی کی یہ آخری دہائیاں اگرچہ غزل گوئی کے عروج کی عکاس ہیں۔ اگر اس دور کی رباعی گوئی کا جائزہ لیا جائے تو اور کئی رباعی گو بھی مل جائیں گے۔ لیکن رباعی گوئی کے حوالہ سے ان شعرا کی خدمات خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ رباعی کے چوبیس اوزان کا استعمال میرے علم کے مطابق صرف یگانہ اور بعد ازاں صوفی افضل فقیر کے ہاں ملتا ہے۔ بعد ازاں ایک طویل خاموشی کے بعد رباعی کی صنف کو بھاری پتھر سمجھ کر چھوڑ دیا گیا۔ قیام پاکستان کے بعد راغب مراد آبادی، صادقین، مقصود انور زاہدی، یزدانی جالندھری اور عبدالعزیز خالد وغیرہم کے نام رباعی گوئی کے حوالہ سے اہم ہیں۔

خالد علیم کی رباعیات حمدیہ، نعتیہ، دعائیہ موضوعات کے ساتھ ساتھ تاریخی و سماجی شعور، سیاسی ادراک اور اخلاقیات کو محیط ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے ہاں رباعی کا شہ موضوع معاملاتِ محبت ہے۔ لیکن یہ محبت وہ محبت نہیں جس کا عموماً چرچا رہتا ہے۔ خالد علیم کی محبت میں تمام کائنات در آئی ہے۔ فرد کی ذہنی و قلبی کشاکش کی عکاس رباعیات خالد علیم کے ہاں گہرے انسانی شعور کا پتہ دیتی ہیں۔ ان کی رباعیات میں تغزل کی آمیزش لائقِ تحسین و توجہ ہے۔

حمدیہ رباعیات میں قدرت خداوندی کی عظمت و وسعت، انسانی اختیارات کا دائرۂ کار--- گویا حدودِ انسانی اور حدودِ رحمانی کا بیان، خدائے عزوجل کی عظمت و قہاری، وجودِ انسان کی ناپائیداری، الوہیت اور اس سے متعلقہ اشیا کے حقائق و اوصاف کا بیان اور کارہائے فطرت دلنشیں پیرایۂ اظہار میں سامنے آتے ہیں۔ خالد علیم تصوف کے قائل ہوں نہ ہوں ان کے ہاں نظریہ وحدت الشہود کی جھلک نمایاں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس ضمن میں چند رباعیات دیکھیے:

تو عالمِ بے حصار، میں ایک سراب
تو قلزمِ بے کنار، میں ایک حباب
ہیں تیرے طلوع سے ازل اور ابد
ہے میرے غروب سے زمانوں کا حجاب

....

مذکورہ رباعی میں انسانی وجود کی ناپائیداری کے بیان کے لیے سراب اور حباب جیسے استعارات نہایت عمدگی سے شاعر کا مدعا بیان کر دیتے ہیں۔ حباب کی عمر ہی کتنی ہوتی ہے۔ پھر انسان کے وجود کو سراب کہنا--- دوسری طرف خدائے بزرگ و برتر کی لامحدودیت، ابدیت اور ہمہ گیری جیسی صفات کے بیان کے لیے "عالمِ بے حساب" اور "قلزمِ بے کنار" جیسی علامات کا استعمال شاعر کے مدعا کو سہولت اور عمدگی سے قاری کے دل و دماغ میں اجاگر کر دیتا ہے۔

خالد علیم کے ہاں دیگر اصنافِ سخن کے مانند رباعیات میں بھی جابجا فکرِ عمیق کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عظمت، قدرت اور جمال کو بیان کرتی ہیں۔ فطرت کا ہر ہر مظہر جمالِ باری تعالیٰ کی شہادت دیتا محسوس ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عنایات کا شمار ہمارے بس کی بات نہیں۔ ان سب باتوں کے بیان میں خالد علیم نے کہیں فصاحت و بلاغت اور تغزل کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا:

ہر ایک گلِ شگفتہ غماز ترا
غنچے کی چٹک میں نغمہ ساز ترا
واللیلِ اذا سجیٰ ادا ہے تیری
والصبحِ اذا تنفس انداز ترا

پھولوں میں مہک بن کے اترتا ہے تُو
ہر غنچہ و گل میں رنگ بھرتا ہے تُو
ہر روز سمیٹ کر ردائے اسود
ہر صبح کرن کرن بکھرتا ہے تُو

محروم کو دولتِ کرم دیتا ہے
محکوم کو قوت و حشم دیتا ہے
دینے جو لگے تو ایک قطرے کے عوض
تو بحر بہ بحر، یم بہ یم دیتا ہے

راتوں کو دنوں میں ڈھالتا ہے بس تُو
ظلمت سے مجھے نکالتا ہے بس تُو
گرتا ہوں میں بار بار لیکن مولا!
ہر بار مجھے سنبھالتا ہے بس تُو

مل جائے مجھے حیاتِ خضر و الیاس
ہو جاؤں میں لفظ لفظ کا نکتہ شناس
ہر نعمت مل جائے مجھ کو لیکن
خالد ہو کس طرح ادا حقِ سپاس

....

اور پھر یہ سب ایک دعا پر منتج ہوتا ہے کہ وہ ذات بزرگ و برتر کائنات کے سب بھید شاعر پر کھول

دے۔ وہ منتجی ہیں کہ ان کے دل و دماغ نورِ خدا سے منور ہو جائیں۔ خالد علیم نے بارگاہ رب العزت میں اپنی کیفیاتِ قلبی کا اظہار انتہائی پراثر انداز میں کیا ہے۔ موضوعِ زیرِ بحث کا احاطہ کرتی ہر رباعی اُن کی عقیدت اور خلوص کی آئینہ دار ہے۔ وہ ملتمس ہیں کہ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے محبوب حضرت محمدؐ کی مدح کی بھرپور توفیق عطا کر دے۔ ان موضوعات کو پیرایۂ اظہار تک لانے میں انھوں نے ادب اور اخلاص کے ساتھ اپنی عاجزی اور اپنے اِدعا کو شعری قالب میں ڈھالا ہے:

اے ربِّ ذوالجلال! روشن کر دے
مولائے لایزال! روشن کر دے
ہوں سر بہ سجود میں فقط تیرے حضور
مجھ پر اپنا جمال روشن کر دے

توصیف کے نغمۂ مخلّد کے لیے
مل جائے کلید، قفلِ اَبجد کے لیے
ہو مستند ایک ایک حرف محمد
اِنشائے محامدِ محمدؐ کے لیے

.....

اور پھر صنفِ رباعی میں باب نعت کھلتا ہے جس میں خالد علیم نبیؐ پاک سے اپنی والہانہ عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ خالد علیم کی نعتیہ شاعری ان کے روحانی عمق اور ان کے جذبۂ مدحتِ آنحضرتؐ سے معمور ہے۔ اور اسی سلسلہ میں ان کے دل میں ایک خواہش بلکہ دعا انگڑائیاں لینے لگتی ہے کہ نعت کے عظیم شعرا جیسے جامی، عرفی، گرامی وغیرہ سے ان کا سلسلہ جڑ جائے۔ لیکن وہ ذاتِ اقدس کہ جس کا ثنا خواں خود خداوند تعالیٰ ہے، انسانی فہم کے حیطۂ فکر میں کیونکر سما سکتی ہے۔ سو اس باب مدح میں خداوند تعالیٰ ہی انسان کا مددمعاون ٹھیرتا ہے۔

خالد علیم کی نعت گوئی سیرتِ طیبہ کے مختلف پہلوؤں کو محیط ہے۔ آپؐ کی سیرتِ پاک قرآن مجید کی جامع تفسیر ہے۔ رسولِؐ پاک کے اوصاف و القابات کی وسعت کا احاطہ انسانی فہم کے بس کا نہیں۔ خالد علیم نے:

تو سیدٌ و مسعودٌ و سعیدٌ و اَسعدٌ
محمودٌ و محمدٌ و حمودٌ و احمدٌ

اور

تو سیدٌ و مسعودٌ و سعیدٌ و اَسعدٌ
اے ماجدٌ و امجدٌ و مجیدٌ و موجودٌ

کہہ کر رسولؐ کی عظمت کے چند ایک پایوں کہہ لیجیے کہ اس ذات بے بہا کے بعض نمایاں اوصاف و القابات کا ایک عکس پیش کیا ہے۔ یہ پیشکش انتہائی خوب صورت اور ان کی فنِ رباعی میں دسترس پر دال ہے:

لب پر ہے مرے ذکرِ رسولؐ مقبول
توصیفِ احمدؐ ہے میرا معمول
مدّاحِ پیمبرؐ دو عالم ہوں میں
ہوتا ہے فلک سے مجھ پہ شعروں کا نزول

مل جائے مجھے جذبۂ جامی آقاؐ
عرفی کی قادرالکلامی آقاؐ
لہجہ ہو مرے سخن میں بوصیری کا
ہو فکر میں ندرت گرامی آقاؐ

سیرت قرآن کی مکمل تفسیر
صورت عرفان کی مکمل تفسیر

ذاتِ پیغمبرؐ خداوندِ ازل
عدل و احسان کی مکمل تفسیر

وہ پاک نگاہ ، پاک دل، پاک لباس
روشن اخلاق اور روشن انفاس
سلطانِ ادراک ، شہِ فکر و شعور
ہر وصفِ پیمبرؐ ہے ایماں کی اساس

.....

خالد علیم کے کلام میں عشقِ رسولؐ کے ذیل میں موجود جذبہ و عقیدت دلوں کو چھو لینے والی کیفیت کے حامل ہیں۔ ان کی رباعیات میں حبِ نبیؐ کے ساتھ ساتھ ادب و احترام کا پہلو بھی نمایاں ہے۔ یہ رباعیات توصیفِ نبیؐ اکرم میں برتر فہمی و روحانی کاوش اور دربار رسالتؐ میں ایک خوب صورت نذرانۂ عقیدت ہیں۔
خالد علیم نے اپنی شاعری میں متعدد اور متنوع موضوعات کا احاطہ کیا ہے، اُن کی رباعیات گہرے شعور اور حساسیت کی مظہر ہیں۔ جذبے کی شدت، الفاظ کی خوب صورت ہُنت دامنِ دل کھینچتی ہے۔
خالد علیم کی رباعیات میں انسانی رشتوں میں پیدا ہوتی دراڑوں کی نشاندہی ملتی ہے۔ یہ دراڑیں، یہ دوریاں نئے دور کی خاص دین ہیں۔ ہم جیسے جیسے ترقی کے زینے طے کرتے جاتے ہیں، وقت آگے بڑھتا جاتا ہے، ہم ایک دوسرے سے دور ہوتے جاتے ہیں۔ اس احساسِ مغائرت کی مثالیں خالد علیم کی نظموں غزلوں میں بھی ملتی ہیں۔ گلوبل ویلیج کی تشکیل شاعر کے نزدیک انسانی رشتوں کی موت ہے۔ ایک حساس انسان ہونے کے ناتے، مشرقی طور اطوار کو احسن جاننے والے خالد علیم کو یہ سب گوارا نہیں:

بے صوت و صدا عرصۂ ہجراں نکلا
اس دشت سے چاند بھی گریزاں نکلا
کیسی تنہائیوں کی وہ شب تھی کہ دل
اپنے ہی وجود سے ہراساں نکلا

صحرائے سفر کی وحشتوں کو چاٹا
کرب لاحاصل کا جنگل پاٹا
دشتِ بے سائباں سے نکلے تو ملا
سڑکوں پر بولتا ہوا سناٹا

ہم دم نہیں کوئی، ہم زباں کوئی نہیں
دم ساز و انیسِ دل و جاں کوئی نہیں
صحرائے حیات کے سفر میں خالد
اک دھوپ ہے اور سائباں کوئی نہیں

دنیا کہ سمٹتی ہی چلی جاتی ہے
رشتوں کی تڑپ کس کو تڑپاتی ہے
صدیوں کی خامشی ہے اپنوں کو محیط
موجود میں محشر کی صدا آتی ہے

.....

''صدیوں کی خامشی'' اور ''موجود میں محشر کی صدا'' نے رباعی کو منفرد اور بلیغ بنا دیا ہے۔
خالد علیم کے ہاں زندگی کی ناپائیداری کا احساس بہت نمایاں ہے۔ جو ان کی رباعیات میں افسردگی کی ایک زیریں لہر کو جنم دیتا ہے۔ زندگی، وقت اور فنا کی حقیقت پر گہرا غور و فکر شاعر پر دنیا کے دھوکے، وقت کی روانی، اور فنا کے اٹل انجام کو واضح کرتا ہے۔ جس سے قاری حقیقت اور زندگی کی بے ثباتی کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ دنیا محض ایک دھوکا ہے۔ دنیاوی سکھ اور خوشیاں عارضی نوعیت کی حامل ہیں۔ خالد علیم

نے جگہ جگہ دریا کو وقت کا استعارہ ٹھیرایا ہے۔ جیسے دریا مسلسل بہتا رہتا ہے، کہیں رکتا نہیں، وقت بھی کسی کے لیے نہیں رکتا۔ یہ تو آگے کے سفر پر گامزن ہے، ایک ناقابلِ گرفت اور بے رحم حقیقت ہے۔ استعارات و علامات کے ذریعہ وقت اور زندگی کی محدودیت کا بیان دل کو بھاتا ہے، سوچنے پر مجبور کرتا ہے، غور و فکر کے در وا کرتا ہے۔ خالد علیم کی شاعری قاری کو زندگی کی گہرائیوں میں جھانکنے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ وہ سوال اٹھاتے ہیں جو قاری کو فلسفۂ زیست پر غور و فکر پر اکساتے ہیں۔ یوں زیست کا مقصد اور اس کا اصل اپنے نقش واضح کرتے چلے جاتے ہیں:

دنیا کیا ہے فریبِ دنیا کیا ہے
چلتا ہوا وقت کا یہ دریا کیا ہے
ہر لمحہ فنا کے گھاٹ اتر جاتا ہے
حیران ہوں، رات دن یہ قصہ کیا ہے

غرقِ بحرِ فنا روانی کیا ہے
چڑھتے دریاؤں کا پانی کیا ہے
سودائے عشق بھی ہے مانندِ حباب
دو چار سمے کی یہ جوانی کیا ہے

ہر سانس پہ موت کا گماں رہتا ہے
اک شور قریبِ رگِ جاں رہتا ہے
کھل جائے جو بھید زندگی کا خالد
جینے کا احساس کہاں رہتا ہے

رہتے ہیں زندگی سے آزردہ ہم
ہیں موت کے ذکر سے بھی افسردہ ہم
اک ساغرِ گلاب ہیں، ہمارا کیا ہے
اک پل زندہ تو ایک پل مردہ ہم

.....

شعور انسان کی حدود، حقیقت کی پیچیدگی اور اس کے عکس کی حقیقت کی رمزوں تک رسائی، جیسے موضوعات کو خالد علیم نے اپنی رباعیوں میں خوب نبھایا ہے۔ لیکن یہ بات بھی واضح ہے کہ ہم حقیقت کو کبھی مکمل طور پر نہیں سمجھ سکتے۔ بس یوں ہے کہ ایسے موضوعات گہرے فلسفیانہ خیالات کو جنم دیتے ہیں۔

خالد علیم منفرد انداز میں فلسفۂ کائنات، انسانی تصور کی محدودیت اور فطرت کے اصولوں کو بیان کرتے ہیں۔ جب شاعر خود کو دنیا کی حقیقت اور اپنے تصورات کے درمیان توازن پیدا کرنے سے قاصر پاتا ہے تو ایک داخلی کشمکش کا آغاز ہوتا ہے۔ شاعر انسانی تجربے کی عکاسی کرتا ہے جہاں ہم سب کسی نہ کسی وقت اپنی توقعات اور حقیقت کے درمیان ایک خلا محسوس کرتے ہیں:

ہر شے کا وجود راز پنہانی ہے
تفہیمِ شعور کیا ہے، نادانی ہے
ہے اصل کے پاس عکس کی عریانی
آئینے کے پاس صرف حیرانی ہے

ممکن نہیں عنصر کا سوا ہو جانا
تقدیر کے پنجے سے رہا ہو جانا
ہر شے کے وجود سے ہے دنیا کا وجود
دنیا کا نصیب ہے فنا ہو جانا

حیرت کی فراوانی گھر پر ہے میاں
باہر بھی گھر جیسا منظر ہے میاں

آنکھیں نہ جلا کہ اندروں جل جائے
خاموش کہ خامشی ہی بہتر ہے میاں
دنیا کا نظر میں جب سراپا اترے
سوچوں کا تراشا ہوا چہرہ اترے
ممکن ہی نہیں یہ کسی صورت خالد
تیرے معیار پر یہ دنیا اترے

.....

دنیا کی حقیقت کو انسانی سوچ اور تخیل کے ذریعے دیکھنے کی کوشش --- ہم دنیا کو اپنی سوچوں اور توقعات کے مطابق سمجھتے اور دیکھتے ہیں، لیکن دنیا اس مثالی تصور سے ہمیشہ مختلف ہوتی ہے۔ وہ بلند معیار یا نظریات جو شاعر نے دنیا کی بابت اپنے تئیں طے کر رکھے ہیں، بہت ارفع و اعلیٰ ہیں۔ یہاں خالد علیم ایک Perfectionist کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ لیکن دنیا کا موجود اِن معیارات پر کبھی پورا نہیں اُتر سکتا۔ اس رباعی کا تیسرا مصرعہ دھیان کی رو کو مایوسی کی جانب بھی لے جا سکتا ہے۔ لیکن میرے خیال میں رباعی کے تیور مایوس کن اختتام کے بجائے حتمی رائے کے سے بنتے نظر آتے ہیں۔ قریب قریب اسی موضوع کا احاطہ کرتی ایک اور رباعی ملاحظہ فرمائیے:

انساں کے وجود کی فنا پر ہے اساس
آئینۂ التباس ہے عقل و حواس
معمورۂ آب و گل ہے، دنیا کیا ہے
عرفانِ حیات کیا ہے، سب وہم و قیاس

.....

کائنات مسلسل تبدیلی کے عمل سے گزر رہی ہے۔ وقت گزرتا چلا جاتا ہے۔ ہر لمحہ اگلے لمحے ماضی کا حصہ بن جاتا ہے۔ ہر لحظہ بدلتے گرد و پیش میں یہ ممکن ہی کس طور ہے کہ انسانی حیات تبدیلی کا شکار نہ ہو۔ ہر لمحہ تغیر پزیر حالات ہمیں زندگی کے عارضی پن کا احساس دلاتے ہیں۔ یہ تغیر وجودی سوالات اٹھاتا ہے، زندگی کی اصلیت اور گہرائی پر فلسفیانہ نگاہ ڈالنے اور کائنات کے بھیدوں تک پہنچنے کی ترغیب دیتا ہے۔

خالد علیم ماضی، حال، مستقبل اور انسانی جدوجہد کے گمشدہ پہلوؤں کو نہایت سلیقے سے بیان کرتے ہیں۔ وقت کے ساتھ سب کچھ عدم میں ضم ہو جاتا ہے۔ انسان اپنی شناخت، یادیں اور خواب سب کچھ کھو بیٹھتا ہے۔ شاعر کی نظر میں زندگی ایک صحرا کے مانند ہے، جہاں ہر قدم پر انسان خود کو مزید گمشدہ محسوس کرتا ہے۔

خالد علیم کی رباعیات ان کے گہرے فکری سفر کی عکاس ہیں۔ وہ اپنے وجود، کائنات کی حرکت، اور انسانی تجربے کی محدودیت کو سمجھنے کی تگ و دو میں رہتے ہیں۔ اِس تگ و دو سے سر اٹھاتے سوال قاری کو بھی اپنے وجود، زندگی اور اس کے مقاصد اور کائنات کے بارے میں غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں:

چکر میں ہے آسمان، گردش میں زمیں
منظر کوئی آنکھ میں ٹھہرتا ہی نہیں
ہر لحظہ بدل رہا ہے مفہوم حیات
دل کی دھڑکن نہ بند ہو جائے کہیں

خالد رگِ جاں میں گردشِ سم کیا ہے
یہ آنکھ میں تیرتا ہوا نم کیا ہے
کیا گھوم رہا ہے میرے چاروں جانب
اُتر، دکھن، پُورب، پچھم کیا ہے

ماضی گم ، حال گم ، کہیں فردا گم
صحرائے عدم میں ہو گیا کیا کیا گم
دنیا کا سفر کٹھن ہے ، پیچیدہ بھی
ہو جاتا ہے بہ ہر قدم رستہ گم

.....

'صحرائے عدم' وسیع و عریض، خالی اور بے معنی جگہ کی علامت ہے، جو انسانی وجود کی غیر یقینی صورت حال اور فنا کو ظاہر کرتی ہے۔ 'رستہ گم ہو جانا' زندگی کی ان غیر متوقع تبدیلیوں کی طرف اشارہ ہے جو انسان کو گمشدگی اور بے سمتی کی کیفیت میں ڈال دیتی ہیں۔
انسان روز اول سے کائنات کے اسرار و رموز جاننے کی کوشش میں ہے۔ زندگی کے بعد موت اٹل حقیقت ہے۔ لیکن موت کے بعد کیا ہوگا۔ یہ سوال بھی انسانی تاریخ میں ہمیشہ اہمیت کا حامل رہا ہے۔ اس سوال کا جواب کہیں مذہبی تاویلوں سے تراشا گیا تو کہیں فلسفیانہ نکات پیش کیے گئے:

زندانِ ہَوا و آب و گِل میں کیا ہے
پتھر کی نوک دار سِل میں کیا ہے
سب کچھ ہم جانتے ہیں لیکن خالد
معلوم نہیں کہ اس کے دل میں کیا ہے

افسونِ مکان و لامکاں سے باہر
اس کارگہِ شیشہ گراں سے باہر
کیا بھید ہے پوشیدہ ، کھلتا ہی نہیں
ہستی کے محیطِ بے کراں سے باہر

ہر چند گزر گئے ، گزرنے والے
لوٹیں گے کہاں ڈوب کے مرنے والے
آؤ دریا سے ہی ذرا پوچھتے ہیں
کیا ہو گئے اُس پار اترنے والے

.....

اس رباعی میں ''دریا'' کو زندگی اور موت کے بیچ کا درجہ قرار دیا گیا ہے۔ خالد علیم کے دماغ میں یہ سوال انگڑائیاں لینے لگتا ہے کہ جو لوگ اس دریا کو پار کر گئے (یہ اشارہ رفتگاں کی طرف ہے) ان کے ساتھ کیا ماجرا پیش آیا۔ دیکھا جائے تو یہ سوال انسانی فطرت کے عین مطابق ہے اور انسانی دماغ کے تجسس کی نمائندگی کرتا ہے۔
زندگی ایک مسلسل سفر کا نام ہے۔ اس سفر میں سہل اور مشکل ہر طرح کے لمحات انسان کو پیش آتے ہیں۔ انسان نے اس سفر کی کوئی سی بھی منزل طے کر رکھی ہو یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ اس سفر میں چھوٹے چھوٹے پڑاؤ ضرور آتے ہیں۔ اس قسم کے پڑاؤ کو آپ ذیلی مقاصد بھی قرار دے سکتے ہیں۔ کہیں ان ذیلی مقاصد کے حصول میں کامیابی تو کہیں ناامیدی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کہیں ناکامیوں سے گھبرا کر انسان اس سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ یہ سب ایک فریب تو نہیں، محض نظر کا دھوکا تو نہیں۔ اور کہیں یہ احساس دامن گیر رہنے لگتا ہے کہ بس تھوڑا سا سفر اور ہے اور اس بعد حتمی منزل۔ ایسے میں صبر اور امید کا قائم رہنا بہت ضروری ہو جاتا ہے۔ شاعر کے نزدیک یہ مشکل لمحات عبوری اور وقتی ہیں اور ان مشکل لمحات یا آزمائشوں کے گزر چکنے کے بعد خوشی اور کامیابی کی منزل ضرور آئے گی۔ گویا مشکل لمحات میں امید کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیے۔ لیکن کبھی کبھی یہ گمان بھی گزرتا ہے کہ ضروری تو نہیں کہ ہر کام متوقع کے عین مطابق

ہو۔ ضروری تو نہیں کہ غم کے بعد خوشی ملے، دکھ کے بعد سکھ ملے۔۔۔ ایسے خدشات انسان کو ایک عجیب و غریب صورت احوال سے دوچار کر دیتے ہیں:

ہر روز نیا باب سفر کھلتا ہے
ہر منظرِ نو نگاہ پر کھلتا ہے
کھلتا ہے دروازۂ مشرق خالد
یا تازہ مصیبتوں کا در کھلتا ہے

اب دُور نہیں کشتیِ جاں کی منزل
مل جائے گا بحرِ آرزو کا ساحل
دشتِ سفرِ فراق تو کچھ بھی نہیں
دو چار گھڑی کہیں بہل جا، اے دل!

ہر عہد کے دامن میں نہیں فصلِ گلاب
ہوں جس سے مسرتوں کے غنچے شاداب
فطرت کا اصول ہے، نہیں ہو سکتا
ہر رات کی کوکھ سے طلوعِ مہتاب

.....

زندگی ناپائیدار ہے تو وقت بے رحم۔ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ بس گزرتا چلا جاتا ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے طور طریقے بھی بدلتے جاتے ہیں۔ شاعر اپنے قاری کو انتباہ کرتا ہے کہ ایک ایسا لمحہ آنے والا ہے جسے موت کہا جاتا ہے۔ جو زندگی کے خاتمے کا اعلان بھی ہے اور اسی لمحہ کی طرف اشارہ کر کے شاعر اپنے مخاطب کو اپنی زندگی کو راہِ راست پر گامزن کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اپنے احتساب کا مشورہ دیتا ہے۔ کہ سیدھے راستے پر آنے کا احسن ترین راستہ خود احتسابی ہی ہے:

آنے کو ہے ایک پل نہ ٹلنے والا
انداز حیات ہے بدلنے والا
گم کردۂ راہ راست کچھ ہوش میں آ
ہے عمر کا آفتاب ڈھلنے والا

.....

انسان کی زندگی علی الخصوص عہدِ موجود میں آسان نہیں۔ یہ مشکلات اور مسلسل جدوجہد سے عبارت ہے۔ لیکن انسان کی کاوشیں ایک حد تک ہی ہو سکتی ہیں۔ کہیں ان کا دائرۂ کار ختم ہو جاتا ہے تو کہیں اعصاب جواب دینے لگتے ہیں۔ شاعر کے نزدیک یہی زندگی کا اختتام ہوتا ہے:

گرداب حوادث میں کہاں تک رہتے
کب تک طوفان کے تھپیڑے سہتے
شل ہو گئے دست و پا تو دم ٹوٹ گیا
بحرِ آشوبِ جاں میں بہتے بہتے

.....

اس رباعی میں خالد علیم نے 'گرداب حوادث' جیسی عمدہ ترکیب تشکیل دے کر انسانی زندگی کا مکمل نقشہ پیش کر دیا ہے۔ لیکن ہمارا مذہب ہمیں مایوس ہونا نہیں سکھاتا بلکہ اسے گناہ قرار دیتا ہے۔ سختیوں کے باوجود، مشکلات کے کوہِ گراں پار کے ہوتے انسان کو حوصلہ ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیے:

بحرِ ستم و جور میں بہنے کے لیے
ظلمت کدۂ جہاں میں رہنے کے لیے
زندہ ہے آدمی مسلسل خالد
حالات کا سرد و گرم سہنے کے لیے

.....

آدمی کا مسلسل زندہ رہنا بہ یک وقت کئی معانی کی

طرف اشارے دے رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ انسانی حیات کا بائیولوجیکل Aspect ہو۔ نسلِ انسانی کا ان سب حالات و واقعات کے باوجود قائم رہنا اور ارتقا کی منزلیں طے کرتے جانا بھی مقصود ہو سکتا ہے۔ بہر حال جو بھی ہو یہ تو طے ہے کہ انسان کا اس کائنات میں حالات کے گرم و سرد کو سہنا یعنی اچھے برے حالات کا سامنا کرنا اس کا مقدر ہے۔ اس رباعی سے صبر، عزم اور حوصلہ مندی کا سبق بھی ملتا ہے۔

خالد علیم کی شاعری میں مزاحمتی رویہ بہت نمایاں ہے۔ وہ حکمران طبقے کی بے حسی کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ انھیں ظالم اور استحصالی نظام سخت گھلتا ہے۔ وہ معاشرتی انصاف پر یقین رکھتے ہیں۔ لیکن جب اپنے حکمرانوں کا رویہ دیکھتے ہیں، ان سے بہتری کی توقع رکھنا انھیں بے کار نظر آتا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ صرف وہ کام کرتے ہیں جو ان کے ذاتی مفاد میں ہوں۔ وہ لوگوں کو اپنے حق کے حصول کا درس دیتے ہیں لیکن شعور و حکمت اور صبر کے ساتھ:

جانے کیا پھونک کر فسوں آتی ہے
ہر روز نیا کر کے جنوں آتی ہے
ایوان سے آ رہی ہے مقتل کی صدا
دربار شہی سے بُوئے خوں آتی ہے

زیب و زینت پہ ہے نہ آرایش پر
اپنی گزر اوقات ہے گنجایش پر
تم تاج و کلاہ و تخت والے ٹھہرے
فائق ہے تمھارا حق ہر آسایش پر

اس دشت میں بُوئے گل نہ گل پیرہنی
یہ ہجر کے صبح و شام ، اللہ غنی
خالد ہم ان دنوں اسیر اس کے ہیں
کہتے تھے جسے لوگ غریب الوطنی

ظلمت کے حصار سے نکلنا ہوگا
دستورِ شب آثار بدلنا ہوگا
لیکن خالد! حصولِ منزل کے لیے
آہستہ آہستہ چلنا ہوگا

ہماری قوم انتشار کا شکار ہے۔ لسانی، عصبی و مذہبی تعصبات نے وطن اور ملت کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ ایسے میں اتحاد و یگانگت اور فکری شعور کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے:

ہر ذہن میں انتشار ، ہر دل میں فساد
جمعیتِ فکر ہے سراپا فریاد
عصبیتِ نسل سے بہم رکھتے ہیں
شیرازۂ ملت و وطن ، زندہ باد!

خالد علیم کی رباعیات میں محبت کے موضوع سے متعلقہ رباعیات بھی خاصی تعداد میں ملتی ہیں۔ ان کا احساسِ محبت لطیف جذبات سے عبارت ہے۔ محبوب کے حسن و جمال کا بیان لطیف پیرائے میں کرتے ہیں۔ لیکن سماجی جکڑ بندیاں--- اور پھر اس محبوب کی یادیں --- جو قیدِ وقت سے بالکل آزاد ہیں۔ ایسے میں شاعر محبوب کے حسن و جمال کی آب و تاب سے متعلقہ یادوں کے سامنے اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتا ہے۔ یہ صورت محبت میں کامل محویت کے اظہار کے طور پر سامنے آتی ہے۔ یہ وہی ماضی کا جیتا جاگتا محبوب ہے

جس کے تصور، جس کی سچی محبت، جس کے عطا کردہ خواب، درد و غم اور بے چینی شاعر کے دل و دماغ پر حاوی رہتے ہیں:

آنکھوں میں ترا عکسِ جمال آ جائے
سورج کو بھی اُدھر زوال آ جائے
پھر تو ہی بتا کہ کیا کروں ، مجھ کو اگر
چلتے چلتے ترا خیال آ جائے

میرے چہرے پہ انتساب اس کا ہے
ہے خواب مرا تو عکسِ خواب اس کا ہے
جو کچھ بھی مجھے دیا ، دیا ہے اس نے
یہ درد ، یہ غم ، یہ اضطراب اس کا ہے

چاہت کے سفر میں ہم پہ کیا کیا گزری
ہر دم اس دشتِ جاں میں تنہا گزری
وہ عمر جو تیری ہم نشیں تھی، اے دوست!
جتنی گزری ، فریب خوردہ گزری

.....

روشن خیالی کا بادا آدم کہلانے والا معروف فلاسفر والٹیئر Voltaire کہتا ہے:

Love is a canvas furnished by nature and embroidered by imagination. Memories are the threads that hold it.
(Voltaire)

لیکن ان سب مراحل سے گزرتے وقت، ہجر و فراق کے مصائب کو جھیلتے ہوئے شاعر کے دل و دماغ میں یہ خلش کروٹیں لینے لگتی ہے کہ وہ محبت اور اس سے وابستہ ہجر و فراق، اور کلفتوں کو سمجھ ہی نہیں پایا، اور یہ سب اس لیے ہوا کہ محبوب کی دلکشی نے اسے کچھ اور سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ خالد علیم کے ہاں معاملات محبت میں ماضی یعنی یادوں کے دیپ جلتے ہیں جو انھیں مختلف کیفیات سے دوچار رکھتے ہیں۔ انھیں وہ دن بھی شدت سے یاد آنے لگتے ہیں جب ہجر میں عاشق کو تنہائی اور رونے دھونے کے علاوہ کسی شے سے کوئی غرض نہیں رہتی۔ ایسے موضوعات کا احاطہ کرتی رباعیات محبوب، اس سے جدائی، اس سے متعلقہ یادیں اور ان کے اثرات، جذباتی کیفیات، یادوں کے گہرے اثرات، محبوب سے حسین اور درد بھرے تعلقات کے تناظر میں نفسیاتی تجربات بیان کرتی ہیں۔ رابندر ناتھ ٹیگور کے نزدیک تنہائی کی گہرائی کو سمجھنا ضروری ہے، اس میں ڈوبنا نہیں:

کیا ہجر کا مفہوم ہے؟ سمجھا ہوتا
یہ درد ہے کیا؟ کبھی تو سوچا ہوتا
اک عمر اسی خیال میں گزری ہے
تو نے مجھے کاش یوں نہ دیکھا ہوتا

ہے یاد مجھے ہجر کا پہلا موسم
آہستہ آہستہ ، مدھم مدھم
عارض پہ ترے ٹپک رہے تھے آنسو
یا سینۂ گل پہ گر رہی تھی شبنم

اتری ہیں مری نظر میں سوچیں تیری
سوچوں میں اتر گئیں ہیں یادیں تیری

میری آنکھوں کو رت جگے دیتی ہیں
جلتی بجھتی اداس آنکھیں تیری

تنہائی تھی اوڑھنا بچھونا تیرا
تنہائی کی آغوش تھی سونا تیرا
اب تک نیندیں اڑا رہا ہے خالد
راتوں کو وہ اٹھ اٹھ کر رونا تیرا

.....

کم و بیش انھی موضوعات کا احاطہ کرتی چند رباعیات دیکھیے:

جب حلقۂ شام سے نکل جاتا ہوں
یادوں کے کھلونوں سے بہل جاتا ہوں
ہر دوسرے روز اے زمام ہستی
سورج کے ساتھ ساتھ ڈھل جاتا ہوں

ہر چہرہ نگاہ سے اتر جاتا ہے
لیکن کچھ کچھ اداس کر جاتا ہے
وہ عکس کب آئنے میں آتا ہے نظر
جو عکس پسِ شام ٹھہر جاتا ہے

چلتے ہیں تو زیرِ سائباں رُکتے ہیں
منزل پہ پہنچ کے کارواں رُکتے ہیں
یادوں کی کوئی بھی نہیں ہے منزل
یادوں کے قافلے کہاں رکتے ہیں

سانسوں میں پیچ و تاب باقی ہے ابھی
شب بیت گئی ہے، خواب باقی ہے ابھی
وہ شام تو ڈھل گئی ہے کب سے خالد
دل میں اک اضطراب باقی ہے ابھی

پہلے سے رہے نہ وہ مہ و سال ترے
بدلے بدلے سے ہیں سب احوال ترے
ہر چند سمیٹ کر رکھے تھے میں نے
دامانِ نگاہ میں خد و خال ترے

.....

خالد علیم نے کلیات نما میں رباعیات کے سیکشن میں والدہ (مرحومہ) کی یاد میں چار رباعیات شامل کی ہیں جن میں والدہ کی وفات کے بعد غم، تنہائی، اور بے بسی جیسی کیفیات کا اظہار انتہائی دلگداز پیرائے میں کیا ہے۔ والدہ کے بغیر زندگی بے معنی محسوس ہوتی ہے۔ ممتا سے منسلک یادیں شاعر کے رنج و غم کی شدت کو مزید بڑھاتی ہیں۔ مولانا روم نے ماں کی محبت کو ایک ایسے دریا سے تشبیہ دی ہے جس کی گہرائی کو ماپا نہیں جا سکتا۔ اور یہ محبت جب انسان سے چھن جاتی ہے تو اس کے دل و دماغ پر کیا گزرتی ہے، اس کا احساس وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس صدمے سے گزر چکے ہیں:

یہ گردشِ آسماں یہیں رک جاتی
میرے قدموں تلے زمیں رک جاتی
اے ساعتِ مرگ کیا بگڑتا تیرا
تو ایک پہر اگر کہیں رک جاتی

آہنگِ زباں، صوت و صدا کچھ بھی نہ تھا
قالب میں ترے بہ جز ہوا کچھ بھی نہ تھا
مجھ سے رخصت ہوئیں جو آنکھیں تیری
کرب خاموش کے سوا کچھ بھی نہ تھا

ہر سمت مچا اندھیر تھا، کچھ بھی نہ تھا
میری قسمت کا پھیر تھا، کچھ بھی نہ تھا
پہنچا تجھے ملنے تو نظر کے آگے
مٹی کا ایک ڈھیر تھا، کچھ بھی نہ تھا

چند اک برسوں کی مہربانی تک تھا
تیری اس مرگِ ناگہانی تک تھا
تُو چھوڑ گئی مجھے تو معلوم ہوا
میرا بچپن فقط جوانی تک تھا

.....

خالد علیم نے عمر خیام کی چنیدہ رباعیات کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ اسی طور انھوں نے پانچویں صدی ہجری کے فارسی شاعر بابا طاہر عریاں کی دو بیتیوں کا اوزانِ رباعی میں ترجمہ کیا ہے۔ عریاں فردوسی کے عم عصر اور عمر خیام کے پیش رو تھے۔ خالد علیم نے ترجمہ کے ساتھ یہ وضاحت بھی کر دی ہے کہ بابا طاہر عریاں کی زبان فارسی دری سے قدرے مختلف فارسی کری یعنی دیہی ہے۔ بعضوں نے عریاں کی دو بیتیوں کو رباعی کہا ہے لیکن رباعی کے مروجہ اوزان میں نہ ہونے کی وجہ سے ان تخلیقات کو رباعیات نہیں کہا جا سکتا۔ عریاں کا مجموعی کلام بحرِ ہزج مسدس محذوف (مفاعیلن مفاعیلن فعولن) کے وزن میں ہے۔ عریاں کے کلام میں موجود چند رباعیات کو خالد علیم نے زبان و اوزان کی بنا پر الحاقی قرار دیا ہے۔

ان منظوم تراجم سے خالد علیم کی فنی و تخلیقی صلاحیت آشکار ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں دو رباعیات ملاحظہ فرمائیے:

محبوب کے چہرے کی طرف ہوں مائل
مت روک مجھے کہ ہوں گرفتارِ دل
آہستہ! ساربان ذرا آہستہ!
چُھٹنے کو ہے مجھ سے کاروانِ منزل
(بابا طاہر عریاں)

ہر چند نہ میں علم سے محروم ہوا
شاید ہو کوئی راز جو معدوم ہوا
لیکن جو خرد کی آنکھ سے دیکھا تو
معلوم ہوا کہ کچھ نہ معلوم ہوا
(عمر خیام)

خالد علیم نے رباعیات محض اپنی فنکارانہ صناعی اور قادرالکلامی دکھانے کے لیے نہیں کہیں۔ انھوں نے اس صنف میں اپنا رنگ و آہنگ ترتیب دیا ہے۔ انھوں نے متنوع موضوعات میں اپنی جودتِ طبع کے جوہر دکھائے ہیں۔ دور اندیشی اور بیدار ذہنی جو اُن کی شخصیت کا نمایاں جوہر ہے، ان کی رباعیات میں بھی عکس ریز ہے۔ ہر صنفِ سخن کے اپنے جمالیاتی تقاضے ہوتے ہیں۔ خالد علیم نے صنفِ رباعی کے جمالیاتی تقاضے بھرپور انداز میں نبھائے ہیں۔ ان کا اسلوب دلکش ہے۔ تغزل کا عنصر ان کی رباعیات میں قاری کی دلچسپی بڑھاتا ہے۔ ان کی رباعیات میں جمالیاتی آسودگی کے باعث دل و نظر کے ساتھ ساتھ روحانی مسرت کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ان کی ہر رباعی میں قاری کو اپنی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

☆☆☆☆☆

ہُما فرید کی کتاب ''کہانی حج بیت العتیق''

ہُما فرید کا مجھ سے تعارف بحیثیت مفتی گروپ کی فین اور کتاب کی سنجیدہ قاری کے تھا۔ اب ان کی پہلی کتاب ''کہانی حج بیت العتیق'' موصول ہونے کے بعد تعارف کے چند قدم مزید طے ہوئے۔

ہُما فرید ایم فل فزیوتھراپی کے ساتھ انگلش لٹریچر کی ایم اے (نمل یونیورسٹی) ہیں۔ ملتان میڈیکل اینڈ ڈینٹل کالج میں لیکچرار کی جاب کی۔ شادی ہونے کے بعد دو سال سے جدّہ میں رہائش پزیر ہیں۔

ان کی تحریروں میں آنے والے وقتوں میں تین رنگ منعکس ہوں گے۔ انگریزی ادب + میڈیکل تعلیم و تجربہ + ممتاز مفتی تصوف

کہانی حج بیت العتیق کا انتساب عکسی مفتی کے نام ہے۔ ''جنھوں نے مجھے لٹریچر سے متعارف کرایا اور لکھنا سکھایا''

یہاں لٹریچر سے مراد غالباً اُردو ادب ہوگا۔

کتاب ''کہانی حج بیت العتیق'' جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، مکہ مکرم مدینہ منوّرہ اور مقامات حج کے مقدس سفر کی روئیداد ہے۔ حج و عمرہ کے سفر و حضر پر متعدد سفرنامے، آپ بیتیاں، احوال نگاری، مضامین آرٹیکل کالم اور کتب لکھی جا چکی ہیں۔ مگر ہر مسافر کا اپنا جہاں تخیل آباد ہوتا ہے۔ مقامات و مناسک ایک ہوتے ہیں باطن کی رنگا رنگی جُدا جُدا ہے۔

اس کتاب کے آٹھ ابواب ہیں۔

ہر باب موضوع سے متعلقہ پنسل سکیچ سے شروع ہوتا ہے مثلاً

''طلع البدر علینا'' پر گنبد خضرا کا سکیچ ہے۔

دردانہ نوشین خان

کتاب کا کاغذ عمدہ اور چھپائی نمایاں ہے۔

دیارِ غیر میں بسنے والے کسی بھی حساس پاکستانی کی طرح ہُما فرید بھی عرب میں قانون کی عملدار دیکھ کر ایٹمی طاقت مسلم ملک کی غیر متوازن غیر مستحکم حالت زار پہ کڑھنے لگتی ہیں اور وہ سڑک کنارے لائن لگا کر بے ہُنر مزدوروں کو بیٹھا دیکھ کر اُداس ہوتی ہیں اُنھیں کہنا چاہتی ہیں کہ واپس لوٹ جاؤ پہلے آج کی دُنیا کا علم سیکھ کر آؤ۔ کمانے کے طریقے سیکھ کر آؤ۔ یوں مت بیٹھو یہاں تنہا، صفحہ نمبر 14 کتاب کی کچھ منظر نگاری خوشگواریت کا احساس رکھتی ہے جیسے مسجدِ نبویؐ میں چوڑیاں چڑھانے والی کے تحفے نے خاموش لبوں پر تبسم کے پھول کھلا دیئے۔

اور جیسے

''بعض اوقات ہم سرسری دُعائیں کرتے ہیں اور قبول ہو جاتی ہیں، (صفحہ نمبر 69)

کتاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ہُما فرید نے اپنے حج کے احوال کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری حج کی قلمی تصویر کشی کی ہے، مساجد، کنویں، اسطوانہ ہر زیارت کا تاریخی پس منظر بیان کیا ہے۔

لکھتی ہیں۔

''وہ زمانہ کیسا ہوگا جب خدا زمین والوں سے رابطے میں تھا''

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ ہی میرے دل میں ہے۔ میں بھی ایسا سوچتی ہوں۔ وہ زمانہ واقعی فضا ہوا، آب و گل، زمین آسمان، گرد ونواح ہر ذرے میں عزت دیا گیا تھا۔ جب ایک عورت کے شوہر نے اُسے ''ماں'' پکار کر شوہر بیوی کا رشتہ مشکوک کر دیا وہ فریاد لے کر دربار رسالت میں پہنچی تو اللہ کی آیات اُتری کہ اللہ سُن رہا تھا.....

اللہ تو اب بھی ہمیشہ ہر زمانے میں سُن اور دیکھ رہا ہوتا ہے مگر اس طرح جواب نہیں ملتا۔ وہ براہ راست رابطہ نہیں کرتا۔

البتہ اُس کے کاتب فرشتے خاموشی سے ریکارڈ تیار کرتے رہتے ہیں۔

کتاب مذکور میں حج کی اقسام درج ہیں۔ مقامات حج کا اُردو ترجمہ قارئین کے لیے کارآمد معلومات ہیں۔ منیٰ کا مطلب بہاؤ (To flow) ہے۔ یہاں قربانی دی جاتی ہے جانوروں کا خون بہایا جاتا ہے۔

''یوم الترویہ'' کا مطلب سیراب کرنا ہے سفر سے پہلے جانوروں کو خوب پانی سے سیراب کرنا (یا موجودہ دور میں گاڑیوں کی

ٹینکی پٹرول سے فُل کرنا یا خود کو توانا و تیار کرنا)

ہُما نے منیٰ کے کیمپ کا جو احوال لکھا ہے وہ تو بہت آرام دہ ہے فرش پر ہونے کے بجائے بیڈ لگے ہیں ہر چھ بیڈز کے بعد چھوٹی سی دیوار اور اس میں اشیاء رکھنے کی الماری ہے الغرض کھانے سے لے کر سونے تک تمام آرام مہیا ہیں۔ میں نے 2005 میں حج کیا تھا، سرکاری سطح پر پاکستان سے حج کرنے والوں کو یہ سہولیات میسر نہیں ہوتی۔

ہُما فرید نے ایک ماڈرن عربی لڑکی کی زبان دانی پہ رشک کیا (صفحہ نمبر 110) اور حسرت سے سوچا کہ میں ایڑھی چوٹی کا زور لگا کر عربی بولنا سیکھ بھی لوں تو یہ کانفڈنس یہ لب ولہجہ کی خوب صورتی جو اللہ نے عربوں کو ان کی مادری زبان کی صورت دی ہے وہ کہاں سے لاؤں گی۔

ہر قوم کو اُس کی مادری زبان پر گرفت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کائناتوں اور جہانوں اور زمانوں کا رب ہے۔ وہ مانگنے والے اور بولنے والے کی نیت اور تقویٰ کو جانچتا ہے۔ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عالمین کے لیے رحمت ہیں۔ عالمین میں ہر بولی بولنے والے انسان تو کُجا مخلوقات تک شامل ہے اور ''کسی عربی کو عجمی پر فوقیت نہیں۔''

میدانِ عرفات میں جو ہال نما بڑے کمرے بنائے جاتے ہیں اور جہاں ایئر کنڈیشنرز چل رہے ہوتے ہیں وہ پرائیویٹ پیکیج والے یا حکمران جماعتوں کے وزیر کبیر ہوتے ہوں گے۔ حج کا اصل لطف عام بندوں میں شمار ہو کر اللہ کے سامنے پیش ہونے میں ہے بشرطیکہ صحت اور جوانی ہو۔

جب بھی حج کا خطبہ ہوتا ہے۔ زیادہ تر عجمی کیونکر انھیں عربی خطبہ تو سمجھ نہیں آ رہا ہوتا وہ عالم تصوّر میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خطبہ حجۃ الوداع ہی دُہرا رہے ہوتے ہیں۔

ہُما فرید لکھتی ہیں۔

''دعاؤں کا دن تھا''

بے شک وہ ایک ایسا دن ہوتا ہے کہ دن گزر جاتا ہے سورج غروب ہونے لگتا ہے دعاؤں کا حرص ختم نہیں ہوتا۔

'کہانی حج بیت العتیق' خوبصورت اور گہرے مشاہدے سے مزّین روئیداد ہے۔ حج کرنے والی نیک دل قلم کار کے ذاتی احساسات کا روزنامچہ ہے۔ پڑھنے والوں کو جہاں اُن کے ذاتی تجربات یاد دلاتا ہے وہاں شوقِ سفرِ حج مہمیز کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔

☆☆☆☆☆

''اجالے اپنی یادوں کے'' میری نظر میں

سیّد مدثر شاہ

پروفیسر سید اظہار الحسن بخاری ''اجالے اپنی یادوں کے'' میرے ہاتھ لگی تو ورق گردانی شروع کی۔ ابتدائی Skimming کے بعد خیال تھا کے باقاعدہ مطالعہ بعد میں کسی مناسب وقت پر کروں گا، مگر ہوا یہ کہ کتاب نے ایسے گرفت میں لیا کہ بس پڑھتا چلا گیا اور مطالعے میں دھنستا چلا گیا اور ہر آنے والے واقعے کے لیے متجسس ہوتا چلا گیا۔ یہ وہ واحد کتاب ہے جسے میں نے مسلسل چار گھنٹے پڑھا اور ایک ہی بیٹھک / نشست میں زیادہ تر حصہ مکمل کیا۔ میرے نزدیک ایک اچھی کتاب کی یہی خوبی ہوتی ہے کہ وہ قاری کو ابتدا ہی سے گرفت میں لے لے۔

''اجالے اپنی یادوں کے'' ایک سوانح حیات بھی ہے اور خودنوشت بھی اور ساتھ ہے ایک سفرنامہ بھی۔ اس قسم کی کامیاب تحریر کے لیے میرے خیال میں مصنف میں دو خوبیوں کا ہونا از حد ضروری ہے۔ ایک گہرا مشاہدہ اور دوسرا تیز حافظہ۔ ماشاءاللہ بخاری صاحب میں یہ خوبیاں کتاب کے مطالعے کے دوران قدم قدم پر بدرجہ اُتم نظر آتی ہیں۔ اپنے ایام حج کا ذکر وہ جس تفصیل اور

شوق وعقیدت سے کرتے ہیں، وہ لاجواب ہے۔ قاری محسوس کرتا ہے گویا وہ بھی بخاری صاحب کے ساتھ ان ہی کے نقشِ پا پر ارضِ مقدس پر رواں دواں ہے۔ منظر کشی بھی خوب اور ایمان کو تازگی بخشنے والی ہے۔ اپنے رفقاء کار کے ساتھ گزرے ہوئے ایام کا تذکرہ وہ جس اسلوب و انداز سے کرتے ہیں، وہ بھی جداگانہ اور منفرد ہے۔ ان کی تحریر میں سوز، ملائم سا طنز اور مزاج دست بدست چلتے ہیں۔ بعض اوقات پڑھنے والا اس بات سے قاصر ہوتا ہے کہ ہنسے یا روئے۔ انگلش ادب میں یہ انداز Charles Lamb کا ہے۔

اپنے دوستوں کی تعریف و توصیف اور شکوہ شکایت کا ذکر جس ڈھب سے کرتے ہیں اس میں ان کی اپنی رواداری، خوش دلی، احترام باہمی، مروّت اور ان کے اندر کے نیک انسان کی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے۔

اپنے ایک قریبی دوست حسن عظیم ورک پر لکھے ہوئے مضمون میں ان کی قلمی تصویر Pen Picture کھینچ کر انھوں نے حد کر دی۔

زبان کی روانی، عبور اور برجستگی نے کتاب کو ایک حسن بخشا ہے جو ہر قاری کو مطالعے کی دعوت دے گا۔ میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ چائے کے ساتھ چائے کی پیالی کو بھی ایسی ہی خوبصورت ہونا چاہیے، جو پینے والے کے ہاتھوں میں جچے۔

آج میں کتاب کے بارے میں بھی یہی بات کہتا ہوں، خوب سیرت کتاب، خوبصورت بھی ہو تو پڑھنے کا مزہ دوبالا ہو جاتا ہے۔

بخاری صاحب کی زیرِ تبصرہ کتاب واقعی دیدہ زیب ہے جسے پڑھنے والا شوق سے اپنے دستِ قبضہ میں رکھتا ہے اور موقع ملتے ہی اس کے مطالعے میں مگن ہو جاتا ہے۔

بخاری صاحب کی پہلی کتاب ہے جو ایک قابلِ رشک کاوش ہے۔ میں ان کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ کتاب لکھ کر وہ امر ہو گئے ہیں اور قوی امید ہے وہ لکھنا جاری رکھیں گے۔ مجھے یہ توقع بھی ہے کہ یہ تحریر ان کی مزید حوصلہ افزائی کرے گی اور ان کے اندر کا لکھاری انھیں آرام سے بیٹھنے نہیں دے گا اور وقتاً فوقتاً ان کو مہمیز لگاتے رہے گا اور ان کی آئندہ آنے والی کتابیں پہلے سے زیادہ رعنائیوں، رنگوں، دلفریبیوں اور دلکشیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوں گی۔ ہم ان کی ہر آنے والی کتاب کا بے چینی اور اشتیاق سے انتظار اور خیر مقدم کریں گے۔ اس سے پہلے کہ:

نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

☆☆☆☆☆

ڈراما ''بساط'' کے مکالموں سے ابھرنے والی چونسٹھ نظمیں

باصر سلطان کاظمی ایک نمایاں اور منفرد شاعر ہیں۔ ان کی شاعری اُردو روایت کے ارتقا کی ترجمانی کرنے کے ساتھ ساتھ ادبی دنیا کے دائرہ کار وسیع کرنے کا باعث بھی بنی ہے۔ صباحت عاصم واسطی کا کہنا ہے:

''باصر سلطان کاظمی ہمارے عہد کی اہم علمی و ادبی شخصیت ہے۔ وہ ایک بے مثال شاعر، عمدہ نثر نگار، مستعد ادبی سفارت کار، ذہین محقق اور ادب کا تجزیہ کار ہے۔''(1)

باصر نے اوائل عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا اور زمانہ طالب علمی ہی میں ان کا کلام ادبی جرائد میں شائع ہونے لگا۔ اہل ادب ان کا شعری مجموعہ آنے کی توقع کر رہے تھے کہ باصر نے اپنا طویل ڈراما ''بساط'' کتابی شکل میں شائع کرا کے انھیں قدرے حیران کر دیا۔ احمد ندیم قاسمی نے لکھا:

''باصر سلطان کاظمی کو میں ایک ہونہار غزل گو کی حیثیت سے تو کب کا جانتا ہوں مگر مجھے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ وہ نثری ادب کی قدیم ترین صنف ڈراما سے بھی گہری دل چسپی رکھتا ہے اور اسے اُردو ڈرامے کی بدحالی کے اس دور میں بھی امکانات سے پُر ایک اُردو تخلیق کرنے کی بھی صلاحیت حاصل ہے۔''(2)

سہیل احمد خان کہا:

''باصر سلطان کاظمی واقعی شاطر نکلے۔ غزل کے مہرے دکھا کر ڈرامے کی چال چل گئے۔''(3)

مبصرین نے ''بساط'' میں شاعری کے رنگ کو خاص طور پر نوٹ کیا۔ روزنامہ ''ڈان'' کے تبصرہ نگار ایس اے نقوی لکھتے ہیں:

"Bisaat is a highly beautiful and extremely poetic and imaginative drama which in spite of the aforesaid qualities is exceptionally "matter of fact" and "to the point." (4)

جیلانی کامران لکھتے ہیں:

ڈراما ''بساط'' اور باصر کاظمی کی طبیعت میں شاعری کی جہت کا اپنا رنگ ہے۔ ان دو دنیاؤں کو ایک دنیا میں ایک واردات میں مربوط کرنا آسان نہیں ہے لیکن باصر کاظمی نے ایسے چیلنج کو قبول کیا۔''(5)

محمد حنیف رامے نے کہا:

''یہ کتاب شاعری کی کتاب بھی ہے، کہانی بھی ہے لیکن یہ شاعری کرنے اور کہانی کا اسلوب ڈرامے کے قالب کو بنایا گیا ہے۔''(6)

پروفیسر مسز شمیم خیال کہتی ہیں:

''یہ اتنی خوب صورت کتاب ہے کہ اس طرح پڑھی جائے گی جیسے آپ شاعری کی کسی کتاب کو پڑھتے ہیں۔ جملے مصرعوں کی طرح مصنف

ماریہ سلیم

پروارد ہوئے ہیں۔'' (7)
بساط کی اشاعت (1987) کے تقریباً چھبیس چھبیس برس بعد، بقول ناصر، انھیں احساس ہوا کہ اس کے ''مکالموں میں جابجا نثری نظمیں پوشیدہ ہیں۔'' (8) مزید کہتے ہیں کہ پھر ''یہ نظمیں ابھر ابھر کر میرے سامنے آنے لگیں اور تقاضا کرنے لگیں کہ میں انھیں اپنے اگلے مجموعے میں جگہ دوں۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح انھیں زیادہ قارئین مل سکتے تھے۔'' (9)
ناصر پہلے تو اس فرمائش کو ٹالتے رہے لیکن نظمیں اپنے مطالبے پر قائم رہیں، اور ان کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔ بالآخر ناصر نے ان میں سے چونسٹھ نظموں کا انتخاب کر کے انھیں ایک الگ مجموعے ''چونسٹھ خانے خانے چونسٹھ نظمیں'' کی صورت دے دی۔
ان نظموں کے موضوعات کم و بیش وہی ہیں جو ڈراما ''بساط'' کے مکالموں میں ملتے ہیں۔ ان میں فرق ہیئت کا ہے۔ اس فرق کا بیان کرتے ہوئے، مانوس ''اجنبی'' (ایک تخیلاتی کردار) مصنف سے کہتا ہے:
''تمھیں یہ وہم کیوں ہو رہا ہے کہ یہ تمھاری ''بساط'' کے مکالمے ہیں؟ یہ ان کے ہمزاد ہیں۔ ذرا انھیں ان کے ساتھ رکھ کے دیکھو، فرق نظر آ جائے گا۔ اور ان میں استعمال کیے گئے الفاظ کی تعداد ''بساط'' کے الفاظ کے دس بارہ فیصد سے زیادہ نہیں ہوگی۔ ڈراما کچھ ایسے مکالموں، جملوں اور الفاظ کا متقاضی ہوتا ہے جو نظم کے لیے زائد ہوتے ہیں۔ اسی طرح کچھ الفاظ جو نظم کے لیے ناگزیر ہوتے ہیں، ڈرامے میں بے محل لگیں گے۔'' (10)
کہا جا سکتا ہے کہ ناصر نے ڈرامے کے ساتھ ہی اپنی نثری شاعری کی بنیاد رکھ دی تھی، جسے اہل نظر پہلے ہی پہچان گئے تھے۔ جس طرح غالب کے خطوط میں نثری نظم کا رنگ محسوس کیا جا سکتا ہے اسی طرح ''بساط'' میں بھی نثری نظم کا عنصر دیکھا جا سکتا ہے، بل کہ بعض مکالموں میں تو ایک طرح سے بنی بنائی نظمیں موجود ہیں۔
اپنی عروضی اور غیر عروضی نظموں کی پیش گوئی ناصر اپنے پہلے مجموعے ''موج خیال'' کے دیباچے میں یوں کرتے ہیں:
''ستمبر 1990 مجھے برطانیہ لے آیا..... میری شاعری کا ایک نیا دور شروع ہوا جواب شاید غزل تک محدود نہ رہے، اگرچہ غزل اپنی جگہ ایک لامحدود صنف سخن ہے۔ (11)
نثری نظمیں غیر عروضی ہوتی ہیں۔ ان میں صرف شاعرانہ احساس پایا جاتا ہے۔ ان کی خصوصیات اور تعریف محمد عارف خان ایسے بیان کرتے ہیں: ''نثری نظم محض ایک ایسی صنف ہے، جس میں نہ تو شعری لوازمت ہوتے ہیں اور نہ ہی نثر کا منطقی بیانیہ۔'' (12)
ناصر کے ہاں ہمیں تخیل اور خیالات کے رنگ محسوس ہوتے ہیں۔ وہ ان نظموں کے ذریعے زندگی کی حقیقتوں کو تمثیلی انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ناصر کے ڈرامے ''بساط'' اور نثری شاعری میں بنیادی فرق اجمال کا ہے۔ اس حوالے سے شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:
''نثری نظم اور نثر میں بنیادی فرق اجمال کی موجودگی ہے۔ نثری نظم اجمال کا اسی طرح استعمال کرتی ہے، جس طرح شاعری کرتی ہے۔'' (13)
ناصر کا اجمال اس کی شاعری کو نثر سے منفرد کرتا ہے۔ ان کی نثری نظموں میں نئے اسالیب، نئی

دریافت اور نئے سانچے کی وضع کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ نثری نظم کے وہ سارے وصف دکھائی دیتے ہیں جن کے ذریعے خارج تو نثر کی شکل میں ہوتا ہے لیکن مواد میں شعری رنگ ہوتا ہے۔ بحر اور قافیے سے مبرا ہونے کے باوجود شعری آہنگ کی عکاسی ملتی ہے۔ باصر کی نثری نظمیں مشینی عہد کی تیز ترین تبدیلیوں میں ایک جمالیاتی انکشاف کی حامل ہیں۔ مخدوم منور اپنی کتاب 'نثری نظم کی تحریک' میں لکھتے ہیں:

''نثری نظم کی صورت حال بھی یہی کچھ ہے۔ یہ وقت کی اہم ترین ضرورت بھی ہے کہ فن کار کی اپنی ذاتی تخلیق پر توجہ دینے کے علاوہ ادب کو اجتماعی سطح پر زندہ رکھا جائے۔ اس سلسلے میں نثری نظم ایک علامت کا کام کر رہی ہے۔'' (14)

نثری نظم فن کار کو داخلی زندگی سے نکال کر اجتماعی زندگی سے ہم آہنگ کرنے کی عظیم کوشش ہے۔ نثری نظم اہلِ علم اور ادبی حلقوں میں محدود ترکیبوں اور اضافتوں سے نکل کر لامحدود سطحوں کو چھوتی ہے اور یہی ضرورت باصر کو محسوس ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

ان نظموں میں استعمال کی گئیں چند تشبیہات پر نظر ڈالتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ''دوستی کا رشتہ جتنا مضبوط ہوتا ہے / اتنا ہی نازک بھی ہوتا ہے / ..... یہ برگد کا درخت بھی ہے / چھوئی موئی کا پھول بھی'' (نظم 21)۔

انسان کے اندر کے سچ کو سمندر میں چھپے موتی سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جیسے سمندر کے اندر طوفان آنے سے موتی باہر آتے ہیں ایسے ہی کڑی باتوں کے کچوکے لگنے، جھٹکے پہنچنے سے انسان کے اندر کا سچ باہر آتا ہے (نظم 34)۔ اسی طرح بُری لگنے والی چبھتی ہوئی باتوں کو تیز ناخن سے سر کھجانے سے تشبیہ دی ہے جو لطف کا باعث بنتی ہیں (نظم 33)۔ اس کے علاوہ غلامی کے ایک لمحے کو زہر کی چٹکی سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جس طرح زہر کی ایک چٹکی پورے تالاب کو غارت کرتی ہے اسی طرح ''ایک لمحے کی غلامی سارے دن کی حکومت پر پانی پھیر دیتی ہے۔ / تمام دن آقا بنے رہنے والے کی شخصیت بدل کے رکھ دیتی ہے۔ / اس کے سوچنے کا انداز مختلف ہو جاتا ہے'' (نظم 50)۔ باصر کاظمی زندگی کو کہیں مداری کا کھیل کہتے ہیں اور کبھی شطرنج کی بازی سے تشبیہ دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ زندگی کے کھیل میں ہم سب شطرنج کے اُس پیادے جیسے ہیں جس کی کوئی حیثیت نہیں۔ ایک ٹوٹ جانے والے تعلق کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ ایک دم ختم نہیں ہوا بل کہ ایسے ''جس طرح بھری مشک میں / چھوٹا سا سوراخ ہو جانے پر / پانی سارے کا سارا ایک دم نہیں نکل جاتا، جیسے شمع آہستہ آہستہ گھٹتی ہے، / جیسے سورج دھیرے دھیرے ڈوبتا ہے'' (نظم 25)۔ ''کچھ محبتیں ایسے زخموں کی طرح ہوتی ہیں / جو بھر جانے پر بھی نشان چھوڑ جاتے ہیں'' (نظم 26)۔

ان نظموں میں استعارات کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ ''ہمارے احباب وہ کھڑکیاں ہوتے ہیں / جن کے ذریعے ہم انسانوں اور زندگی کو دیکھتے ہیں'' (نظم 28)۔ باصر رنگ اور ساز کو زبان کا استعارہ بھی دیتے ہیں: ''مصوروں کے رنگ، موسیقاروں کے ساز، اُن کی زبان ہوتے ہیں'' (نظم 56)۔ ایک نظم میں ''ہما'' کی تلمیح بھی ملتی ہے۔ ہما ایک تصوراتی پرندہ ہے جسے خوش قسمتی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ یہ ایک فرضی پرندہ ہے

جس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ جس کے سر پر سے گزر جائے وہ بادشاہ بن جاتا ہے۔ شاعر کو کھلے آسمان تلے یہ خوف لاحق رہتا ہے کہ کہیں اس پر سے ہما نہ گزر جائے کیوں کہ اس کے لیے تاج محض سر درد ہے (نظم 46)۔

''چونسٹھ خانے چونسٹھ نظمیں'' کا تجزیہ کیا جائے تو باصر کی بے شمار خصوصیات سے پردہ سرکتا ہے۔ وہ تشبیہات، استعارات اور تلمیحات استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ موسم، ماحول اور قدرتی مناظر کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔ جابجا قدرت کے مظاہر، مثلاً پہاڑ، دریا، صحرا، سورج، برف، درخت، پھول کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں باصر کے فلسفی رنگ کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ کہتے ہیں ''ہر آدمی کے اندر ایک اونٹ ہوتا ہے'' (نظم 20)۔ یعنی وہ انسان کے بدلہ لینے کو اونٹ کے بیر سے تشبیہ دیتے ہیں کہ جس طرح اونٹ بدلہ لیتا ہے انسان بھی دل میں بات رکھ کر اونٹ کی طرح بدلہ لیتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ''سوچ کا سفر انتہائی خطرناک مہم ہوتا ہے۔ / یہ ہمیں کہیں بھی لے جا سکتا ہے، کسی ایسے دشت میں بھی جہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہو'' (نظم 30)۔

ان نظموں میں ہمیں زندگی، غربت و افلاس، بھوک، جیت، ہار، خوشی اُداسی، بادشاہت اور غلامی کے علاوہ انسانی خصلت کے تمام پہلوؤں کے حوالے سے فلسفے ملتے ہیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی باصر کی فلسفیانہ طبیعت کو یوں بیان کرتے ہیں:

''باصر کا مزاج فلسفیانہ ہے..... وجودیت کا اثر اس ڈرامے میں خاصا نمایاں ہے..... کہیں مادی فلسفے کے رنگ و آہنگ بھی نمایاں ہوتے ہیں - طبقاتی تفریق، دولت کی غلط تقسیم، شاہیت اور سرمایہ داری سے نفرت اور دولت کی مساوی تقسیم، ایک نئے نظام حیات کے قیام اور زندگی کو متوازن انداز سے بسر کرنے کے خیالات بھی اس ڈرامے کی فضا اور ماحول میں گونجتے ہوئے سنائی دیتے ہیں۔''' (15)

باصر کہتے ہیں اگر ہم زندگی میں کچھ حاصل کرتے ہیں تو اس کے بدلے میں ہمیں بہت کچھ کھونا پڑتا ہے۔ ایک طرف دیکھنے، ایک جگہ پاؤں رکھنے سے ہم دوسری سب جگہوں کو نہیں دیکھ جاتے، نہ وہاں پاؤں رکھ سکتے ہیں۔ ہر جگہ ہونے کی خواہش ہمیں ڈبو دیتی ہے (نظم 1)۔ زندگی میں کامیاب ہونے کے لیے خوشامد پسندی، حسد، بغض اور نفرت کو قریب نہ آنے دینے کا مشورہ دیتے ہیں جو کہ ہر آدمی کے اندر موجود ہیں (نظم 24)۔ زندگی میں سب رشتوں کو غرض سے لبریز قرار دیتے ہیں۔ رشتوں میں عزت، محبت صرف ان سے جڑی توقعات کی وجہ سے ہوتی ہیں (نظم 17)۔ کسی سے اپنے فیصلے کے مطابق عمل کرانے کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اس کا ''بہترین طریقہ یہی ہے کہ اپنا فیصلہ اُس کے اندر اِس طرح اتار دیا جائے اور ایسے حالات پیدا کر دیئے جائیں کہ وہ کام تو ہماری مرضی کے مطابق کرے لیکن رہے اس خوش فہمی میں کہ وہ ایسا اپنی مرضی سے کر رہا ہے۔'' (نظم 31)۔

زندگی میں ہر لمحے ہمیں دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ ''اپنی آرزوؤں، صلاحیتوں اور قوتوں سے / اپنے خوابوں، پیاروں اور ساتھیوں سے، / اور بالآخر خود زندگی سے'' (نظم 41)۔ باصر کے مطابق زندگی کے

ہر کھیل میں ابتدا اختتام پر اثر انداز ہوتی ہے اور اختتام بھی ایسا ہو کہ وہ ابتدا کی محنت کو ضائع نہ کرے (نظم 58)۔ زندگی اصل میں جدوجہد اور عمل کا نام ہے۔ جو لوگ محنت کرتے ہیں اپنی مرضی کی زندگی بسر کرتے ہیں اور جو بے عملی کا مظاہرہ کرتے ہیں زندگی انھیں حالات کی رو میں بہا دیتی ہے، ان کی شخصیت ان کے اندر دفن ہو جاتی ہے۔ باصر کے انسانی زندگی کے حقائق کے حوالے سے ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

''اور جگہ جگہ رمز و کنایہ کے پردے میں انسانی زندگی کے ایسے ایسے حقائق اور اسرار و رموز کھلتے ہوئے نظر آتے ہیں جن سے علم و شعور پر جلا ہوتی ہے۔'' (16)

انسانی عادات، خصلتوں کا فلسفہ بھی باصر کے ہاں نظر آتا ہے۔ آدمی دوسروں سے بڑا دکھنے کے لیے اپنے ہر عمل کو اعلیٰ وارفع قرار دیتا ہے، اس کے گن گاتا ہے (نظم 35)۔ بعض انسان غرور تکبر سے اتنے بلند ہو جاتے ہیں کہ نظر آنا بند ہو جاتے ہیں یعنی اہمیت کھو دیتے ہیں (نظم 38)۔ ''آدمی اپنے سے کم تر لوگوں میں رہنا پسند کرتا ہے/ یا ایسی جگہ/ جہاں اُس سے برتر بھی کمتر بنے رہیں'' (نظم 39)۔ انسان میں قناعت کے فقدان کے حوالے سے باصر کہتے ہیں کہ انسان کو جتنا مرضی حاصل ہو جائے وہ خوش نہیں ہوتا، اسے ہمیشہ یہ احساس دلاتا جاتا ہے کہ دنیا کے اتنے بڑے خزانوں میں سے اس کے پاس کیا ہے؟ لوگ ''کھجور کے درخت سے سایہ مانگتے ہیں/ اور برگد کے درخت سے پھل'' (نظم 16)۔

لوگ ہر کھیل صرف جیتنے اور دوسروں کو اپنے سے کمتر ثابت کرنے کے لیے کھیلتے ہیں (نظم 44)۔ باصر کے مطابق شکست انسان کو کوتاہ نظر اور تنگ دل بنا دیتی ہے اور جیت اعلیٰ ظرف بنا کر جانی دشمن کو بھی بخش دینے کا حوصلہ دیتی ہے۔ ہار جانے پر ہم مخالف کے بے جان گھوڑے کو بھی معاف نہیں انسان کو ایک اچھے کھلاڑی کی طرح پرفارمنس دکھانا پڑتی ہے، محض اچھا کھلاڑی ہونا جیتنے کے لیے کافی نہیں (نظم 59)۔ اسی طرح صرف اچھا انسان ہونا کافی نہیں۔ کامیابی کے لیے اچھے عمل، کردار کا مظاہرہ بھی ضروری ہے۔

بادشاہت کے حوالے سے باصر لکھتے ہیں کہ بادشاہ کے الگ اُصول اور ضابطے ہوتے ہیں۔ عام آدمی بادشاہ والے کام نہیں کر سکتے اور بادشاہ عام آدمی جیسے کام نہیں کر سکتا۔ ''کچھ کام، عام آدمی کریں تو داد پاتے ہیں، بادشاہ کریں تو بُرے لگتے ہیں۔ بعض باتیں جو عام آدمیوں کے لیے معیوب خیال کی جاتی ہیں بادشاہوں کے لیے نہایت شان در سمجھتی جاتی ہیں'' (نظم 49)۔ بادشاہ کے تمام لاؤ لشکر، شان و شوکت، دھوم دھام یہ ظاہر کرنے کے لیے ہوتے ہیں کہ وہ ایک عام آدمی سے مختلف ہے (نظم 47)۔ اصل میں بادشاہ اور پیادے کی حقیقت ایک ہی ہے۔ بادشاہ اپنی بقا کے لیے پیادے کا مرہون منت ہوتا ہے اور کبھی اتنا کمزور اور بے بس ہو جاتا ہے کہ دشمن کا پیادہ اسے بساط سے اٹھا دینے کے لیے کافی ہوتا ہے (نظم 48)۔

باصر کے ہاں ہمیں خوش اور ناخوشی کا فلسفہ بھی ملتا ہے۔ ''خوش ایک زندہ چیز ہے/ جو مزید خوشی کو جنم دے سکتی ہے۔ /اسی طرح/ ناخوشی سے ناخوشی

پیدا ہوتی ہے" (نظم 2)۔ ایک اور جگہ کہتے ہیں کہ "خوشی ہمارے اندر اُسی وقت پروان چڑھتی ہے / جب ہم اسے باہر فروغ پاتا دیکھیں" (نظم 4)۔ باصر کے ہاں ہمیں پردیس کی سختی اور مشکلات کا ذکر بھی جا بجا ملتا ہے۔ "مجھے بدیس میں عزت ملی، مگر وہ عزت / جو اجنبیوں، بدیسیوں یا مہمانوں کو دی جاتی ہے" (نظم 11)۔

غربت، بھوک اور افلاس کے حوالے سے باصر لکھتے ہیں: "اُن کے بچوں کے کمر سے لگے ہوئے پیٹ / اور ننگے بدن دیکھ کر / دل ڈوبنے لگتا ہے۔ / ..... اگر اس دل میں یہ امید نہ ہوتی / کہ یہ کبھی اُن کے لیے کچھ کر سکے گا / تو یہ کب کا دھڑکنا بند کر چکا ہوتا" (نظم 12)..... طبقاتی فرق کو باصر کی شاعری میں اقبال ظہیر تاشی یوں بیان کرتے ہیں:

"طبقاتی شعور کو بحالی کے لیے باصر جبر و استحصال کی قوتوں کے خلاف جہاں کرتا ہے اور اپنے دھیمے دھیمے لہجے میں اس کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔" (17)

چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ باصر ایک شاعر اور ڈراما نگار علاوہ ایک فلاسفر کی حیثیت سے بھی سامنے آتے ہیں۔

"چونسٹھ خانے چونسٹھ نظمیں" کے مذکورہ بالا دیباچے میں باصر نے جنس کارنیلیس کا یہ قول نقل کرتے ہوئے کہ جس طرح قاری کتاب کو ڈھونڈتا ہے اسی طرح کتاب بھی قاری کو ڈھونڈتی ہے، یہ فیصلہ کیا کہ وہ مذکورہ نظموں کی راہ میں رکاوٹ بننے کے بجائے انھیں کتابی شکل دے کر قارئین کے سامنے پیش کر دیں۔ ان کے خیال میں اگر قارئین کو ان میں سے چند نظمیں بھی پسند آ گئیں تو وہ یہ سمجھیں گے کہ ان نظموں کی جدوجہد رائیگاں نہیں گئی۔ باصر کی یہ نظمیں کس حد تک قارئین میں پزیرائی حاصل کر سکیں گی، اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔

اختتام: ادب کی اصناف کا آپس میں گہرا رشتہ ہے۔ ان کی ہیئتیں اور تخلیق کے تقاضے مختلف ہونے کے باوجود ان میں کئی اوصاف مشترک بھی ہوتے ہیں۔ زیر نظر مطالعے نے یہ دیکھا کہ کس طرح باصر سلطان کاظمی کے ڈرامے "بساط" کے مکالموں سے نثری نظمیں ابھر کر سامنے آئیں۔ ان نظموں کا مجموعی جائزہ لینے کی کاوش بھی کی گئی۔ باصر کی نثری نظمیں ان کی ذہنی رو، جذبے کی شدت اور احساسات کی عکاسی کرتی ہیں۔ باصر کی شاعری میں وہ تمام خصوصیات ملتی ہیں جو فطری اور بنیاد لہجے میں پائی جاتی ہیں۔ داخلی کیفیات اور جذبے کی شدت و تاثر میں وہ ضبط و اعتدال ہے جو فکر کے تقاضوں کی تکمیل کرتی ہے، جس میں شاعری کی انفرادیت اور خصوصیت کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کی نظمیں اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ ان میں خیال کی متانت بھی ہے اور اظہار کی تازگی بھی اور شاعر کے عمیق مشاہدے کی بڑی برجستگی سے اظہار بھی ملتا ہے۔ ان کے تاثرات پانی کی طرح رواں معلوم ہوتے ہیں۔ لہجہ، ندرت اور تازگی کے احساس سے بھرپور ہے جو قاری کے دل و دماغ پر اثر چھوڑتا ہے۔ باصر کی نثری نظمیں ذاتی کرب و نشاط اور اطراف میں رونما ہونے والے حادثات و واقعات کی آئینہ دار ہیں۔ شاعری کا اسلوب، زبان سہل، اور آسان ہیں۔ جملے اس قدر گنجلک نہیں کہ تفہیم نہ ہو۔

☆☆☆☆☆

شگفتہ نعیم ہاشمی زندگی کے احساس سے بھرپور شاعرہ

فیصل زمان چشتی

زندگی دھند میں لپٹے ہوئے منظر کی طرح
نہ دکھائی ہی پڑی اور نہ اوجھل ہی پڑی

....

آجکل کے مادہ پرست اور مصنوعی دور میں اگر کوئی صاحب بصیرت اور صاحب احساس شخصیت مل جائے تو یہ کسی نعمت غیر مترقبہ سے ہرگز کم نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر وہ تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال ہو اور شاعر بھی ہو تو یقین مانیے آپ قسمت کے دھنی ہیں۔ شگفتہ نعیم ہاشمی بھی ایسی ہی شخصیات میں سے ایک ہیں جو اس نفسا نفسی اور گھٹن زدہ دور میں علم و ادب کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں اور کسی صلہ وستائش کی پروا کیے بغیر اپنے علمی و ادبی ارتقائی سفر کو بڑی سرعت اور کامیابی سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔

آج جہاں ہر طرف شاعری کا چرچا ہے۔ روزانہ کی بنیاد پر منوں اور ٹنوں کے حساب سے شاعری مارکیٹ میں آرہی ہے۔ بلا مقصد، بے حساب اور بے لگام لکھا جارہا ہے۔ کچھ لوگ تو خیال و فکر کی چوری (سرقہ) کو بھی اہمیت نہیں دیتے اور اسے جائز قرار دیتے ہیں مگر کچھ جینوئن اور حقیقی شعرا اس کی نہ صرف مذمت کررہے ہیں بلکہ اس کے خلاف علم جہاد بھی بلند کیے ہوئے ہیں تاکہ مصنوعی لوگوں کی حوصلہ شکنی ہو اور جینوئن تخلیق کاروں کے آگے بڑھنے کے لیے راستے ہموار کیے جاسکیں۔

ان حالات میں کسی بھی شاعر کا انفرادیت قائم رکھنا اور اپنا اسلوب جداگانہ کرنا واقعتاً ایک مشکل کام ہے اور اس کٹھن مرحلے میں بھی شگفتہ نعیم ہاشمی خاصی کامیاب نظر آتی ہیں۔ انھوں نے اپنے اسلوب اور لہجے کو منفرد رکھا اور حتی المقدور کوشش کی کہ اپنا جداگانہ تشخص برقرار رکھا جائے اور میرے خیال کے مطابق وہ اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب بھی رہی ہیں۔

"آبگینے خوابوں کے" ان کے شعری سفر کا دوسرا پڑاؤ ہے جس میں ان کا تخلیقی شعور اور ادراک اپنے اوج کمال پر نظر آرہا ہے۔ یہ ان کا دوسرا شعری مجموعہ ہے جو اشاعت کے مراحل میں ہے اس سے پہلے 2018 میں ان کا پہلا شعری مجموعہ "حسرتیں" منصۂ شہود پر آچکا ہے۔

شگفتہ نعیم ہاشمی زندگی کی شاعرہ ہیں۔ زندگی اور اس سے جڑے معاملات اور معاشرتی مسائل و اقدار ان کی شاعری کا بنیادی جزو ہیں۔ یہ ادب برائے زندگی کی قائل نظر آتی ہیں اور انسانی احساسات و جذبات کی ترجمان ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں زندگی، زندگی کی بے ثباتیاں اور تلخ حقیقتیں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں اس کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں سنجیدگی اور

متانت اپنے پورے وقار کے ساتھ نظر آتی ہیں کیونکہ یہ معتبر اور مؤثر لہجے میں بات کرنے کا ہنر اور ڈھنگ جانتی ہیں معاشرے میں ہونے والی بے ضابطگیوں، ناانصافیوں اور بے اعتدالیوں پر ان کا قلم رُک نہیں پاتا اور بے اختیار ہو کر حالات کا نوحہ لکھتا ہے غیر مطمئن اور کمزور انسانی رویے بھی ان کی شاعری کو مہمیز عطا کرتے ہیں۔ یہ داخلی معاملات کے ساتھ ساتھ خارجی معاملات اور مسائل پر اپنا قلم اس خوب صورتی، فنی پختگی اور مہارت کے ساتھ اٹھاتی ہیں کہ اشعار سیدھے دل میں اُتر جاتے ہیں:

جی بھی لیا ہے جینے کی حسرت بھی رہ گئی
سب جان بھی لیا ہے پہ حیرت بھی رہ گئی

زیست ملبہ ہے ٹوٹے خوابوں کا
بین کرتی ہیں حسرتیں جس پر

.....

''آبگینے خوابوں کے'' شگفتہ نعیم ہاشمی کی قلبی وارداتوں اور احساسات و جذبات کی شکست و ریخت کا چشم دید گواہ ہے۔ انھوں نے اپنے شعری وجدان اور جذباتی مدوجذر کی ہلچل سے اپنے لاشعور میں پیدا ہونے والے فکری بہاؤ سے ایسے ایسے اشعار تخلیق کیے ہیں کہ بڑی دیر تک قاری اسی کیفیت میں رہتا ہے۔ کچھ اشعار دیکھیے:

سرے پہ آخری سیڑھی کے سانپ بیٹھا ہے
کوئی چڑھے تو سہی چند زینے خوابوں کے

دیکھ پندار کی قیمت تو چکانا ہوگی
کچھ سزا سر کو اٹھانے کی اٹھانی ہوگی

دیوار اٹھا رکھی ہے ہر شخص نے دل میں
اور ہم ہیں کہ دیوار میں در ڈھونڈ رہے ہیں

یہ اب کی بار چمن میں عجب نظارہ ہے
جلے ہوئے ہیں کئی پھول اور بہار بھی ہے

کہیں تو درد کی زنجیر یا خدا ٹوٹے
کہیں تو ختم ہو یہ سلسلہ عذابوں کا

.....

زندگی کے حقائق اور سماجی رویے بیان کرتے ہوئے بعض اوقات جب ان کا لہجہ قدرے تلخ ہو جاتا تو پھر اس طرح مخاطب ہوتی ہیں۔

باتوں باتوں میں کی وفا ہم سے
خاک چاہت تھی، سب سیاست تھی

ہمارے قتل کو کر دیں گے خودکشی ثابت
یہ لوگ سارے شواہد بھی ڈھونڈ لائے ہیں

اس نے سورج کی روشنی لے لی
ہم کو بہلا دیا دکھا کے چراغ

کون اچھا ہو بھلا ایسی مسیحائی کا
درد ہوتا ہے کہیں ہاتھ کہیں رکھتا ہے

.....

شگفتہ نعیم ہاشمی ایک علمی و ادبی خانوادے سے تعلق رکھتی ہیں اس لیے ان کے گھر کے ماحول میں علم و ادب کی روشنی اور اردگرد قلم، کتاب ہی نظر آئی اس لیے ہمیں ان کی شاعری میں وہ سنجیدگی اور آگہی ملتی ہے جو عام طور پر مفقود ہوتی ہے۔ ان کی علم و ادب سے قربت ایک فطری عمل تھا اسی لیے انھوں نے شاعری کو اپنے لیے ذریعۂ اظہار بنایا جو فنون لطیفہ میں سب سے زیادہ خوب صورت اور مؤثر ذریعہ اظہار ہے۔

جس طرح ان کی طبیعت اور شخصیت میں کوئی تصنع یا بناوٹ نہیں بالکل اسی طرح ان کی شاعری بھی

اور تخلیقی شائستگی، خوب صورتی اور برجستگی کا حسین امتزاج ہے۔ انھوں نے اپنی قوت متخیلہ اور شعور و ادراک کے خوبصورت سنگم سے اپنی شاعری تخلیق کی ہے۔ یہ زندگی کے حقائق کو اپنی نظر سے دیکھتی ہیں اور اسی شدت سے انھیں محسوس بھی کرتی ہیں۔ جذبات و احساسات کے ساتھ ساتھ انسانی معاملات اور رویے ان کی قوت خیال اور فکری ریاضت کے کام آئے۔ انھوں نے معاملات اور معاشرتی مسائل کو جس انداز سے دیکھا ہے اس سے ان کی شاعری میں آفاقیت در آئی اور ان کی شاعری کا کینوس وسیع ہو گیا ہے۔ وہی تخلیق اعلیٰ و ارفع تصور کی جاتی ہے جس کی جڑت عام لوگوں اور معاشرے کے ساتھ مضبوط ہو اور ان کی شاعری سے یہ بات عیاں ہے کہ یہ انسانیت اور اس کو درپیش چیلنجز چاہے وہ انفرادی سطح پر ہیں یا اجتماعی سطح پر ہیں ان کا مشاہدہ اور تجزیہ کر کے ان کو اپنی شاعری کا حصہ بنا رہی ہیں۔ یہ وضع داری اور متانت و وقار جو ان کی شخصیت کا حصہ ہے، ان کی شاعری میں بھی در آیا ہے کیونکہ شعور و آگہی کی فطری صلاحیت ان کی شخصیت کا حصہ تھی جو ان کے کلام میں اسی انداز اور اسی شدت سے موجود ہے۔

شگفتہ نعیم ہاشمی کی شاعری میں ایک ایسی طاقت ہے جو قاری کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لیے رکھتی ہے۔ ان کی غزلیات کے قوافی و ردائف اور بحور مترنم بھی ہیں اور اپنی طرز و اسلوب میں منفرد بھی ان کے الفاظ کا چناؤ بھی کمال ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کا خوب صورت اظہاریہ شعر کو اتنا لطیف اور ملوک بنا دیتا ہے کہ وہ دل کے نہاں خانوں میں اُتر کر روح کو سرشاری عطا کرتا ہے اور زبان سے بے خودی کے عالم میں واہ واہ کی صدائیں آنے لگتی ہیں کیونکہ ان کا شعر ان کے مشاہدات تجربات اور تجزیات سے کشید ہو کر قرطاس پر منتقل ہوتا ہے اسی وجہ سے وہ دل کے تاروں کو چھیڑتا بھی ہے اور اس کی کیفیات تبدیل کرنے پر بھی قدرت رکھتا ہے:

اک درد کہ ہیں گریہ کناں پاؤں کے چھالے
اک شوق کہ ہم وجہ سفر ڈھونڈ رہے ہیں

مرا تو مطمع ہستی تری تلاش میں تھا
اک ایک سانس تری جستجو میں گزری ہے

.....

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ شگفتہ نعیم ہاشمی کی شاعری میں زندگی اور زندگی کے ساتھ جڑے ہوئے حالات کے سبھی رنگ موجود ہیں۔ کبھی وہ ان کو بیان کرتے ہوئے آبدیدہ ہو جاتی ہیں اور کہیں کہانی بیان کرتے ہوئے انبساط و مسرت کا احساس ان کی شاعری سے چھلکنے لگتا ہے اور یہی زندگی کی اصل حقیقت بھی ہے۔ زندگی کی دھوپ چھاؤں ان کو کبھی اداس اور ملول کر جاتی ہے تو کبھی خوشیوں اور بہاروں کے رنگ دکھائی دینے لگتے غرضیکہ ہر قسم کی کیفیات اور احساسات کا بہاؤ اور رچاؤ ان کی شاعری کو ایک ممتاز مقام پر فائز کرتا ہے۔ یہ شعر کو کتھارسس کا بہترین ذریعہ سمجھتی ہیں اسی لیے ان کے اشعار میں زندگی کی تلخیاں حقیقتیں اور سچائیاں اپنے احساس کی شدت اور جذبات کی تمکنت کے ساتھ موجود ہیں جس سے ان کے شعر کا وقار اور اس کا مقام بلند ہو جاتا ہے۔ دکھ، سکھ، غم، خوشی، غصہ، گلہ و شکوہ، محبت، اپنائیت، رشتوں کا احترام اور تقدس ان کی شاعری میں زیر بحث رہتے

ہیں۔ ان کے احساسات بھی ہمیں آبگینوں کی طرح نازک دکھائی دیتے ہیں جو ذرا سی بے اعتنائی، لاپرواہی اور بے رخی سے کرچی کرچی ہو جاتے ہیں اسی لیے ان کی شاعری قاری کے دل پر اثر انداز ہوتی ہے:

شورشیں زندگی سے کم نہ ہوئیں
ایک کے بعد ایک آفت تھی

لفظ وفا کے اب وہ معانی نہیں رہے
دور جدید ہے ذرا ترمیم کیجیے

کتنے ہی خواب ادھورے ہیں مری آنکھوں میں
سارے ممکن ہیں اگر کن فیکوں ہو جائے

تلخیاں زیست کو بے رنگ کیے رکھتی ہیں
اک ترا رنگ ہے جو اس کو حسیں رکھتا ہے

اس نے تو جوئے عشق میں پھینکا تھا ایک سنگ
پھر دل میں دائروں کا سفر دیر تک رہا

.....

ان کا ایک شعر جو زندگی کی اصل حقیقت اور زندگی کی بے ثباتی کی طرف نہ صرف اشارہ کرتا ہے بلکہ دعوت فکر بھی دیتا ہے کہ یہ زندگی کب اپنے اختتام کو پہنچ جائے کسی کو کچھ بھی خبر نہیں ہے۔ یہ شعر اتنا سچا ہے کہ اگر کوئی انسان نہ بھی مانے تو موت ایک دن سامنے آکر اس کو زندگی کی حقیقت کا پردہ فاش کر دیتی ہے:

کچھ زندگی کے کھیل کا آنے لگا تھا لطف
پھر یوں ہوا کہ موت نے پردہ گرا دیا

.....

''آبگینے خوابوں کے'' میں غزلیات کے ساتھ ساتھ کچھ خوب صورت نظمیں بھی موجود ہیں جو ان کے شعری وفور کا بھی پتہ دیتی ہیں۔ کیونکہ میرے خیال میں نظم کہنا غزل کی نسبت زیادہ مشکل ہوتا ہے جہاں شاعر کی تخیلاتی پرواز کا بھی پتہ چلتا ہے کہ شاعر میں کتنا فکری بہاؤ اور شعری رچاؤ موجود ہے اور فکر و خیال پر اس کی کتنی گرفت ہے اگر اس تناظر سے دیکھا جائے تو شگفتہ نعیم ہاشمی اس حوالے سے بھی ممتاز نظر آتی ہیں کیونکہ غزل میں قافیہ ردیف کی پابندیوں اور اوزان کی بندشوں کے باعث شاعر کئی دفعہ وہ بات مکمل کہہ نہیں پاتا جو وہ کہنا چاہ رہا ہوتا ہے مگر نظم میں ایسا نہیں ہوتا اسی لیے انھوں نے اپنی نظموں میں بڑی سہولت، سلاست اور روانی سے اپنی بات اور اپنا خیال قاری تک بڑی کامیابی سے پہنچایا ہے۔ یہ بات ان کی شاعرانہ صلاحیتوں اور علمی کاوشوں کا ایک اور منہ بولتا ثبوت ہے۔ ان نظموں میں انھوں نے بڑے عمیق موضوعات پر بڑی خوب صورتی، نفاست، پختگی، سلاست اور فنی ہنرمندی سے بات کی ہے۔ کتاب کے آخر میں قطعات اور فردیات بھی موجود ہیں ان میں بھی ان کا حسن خیال اور حسن بیاں اپنے اوج پر نظر آتا ہے اور ہم ان کی فنی و فکری پختگی اور عصری شعور کے قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ زیر نظر کتاب ''آبگینے خوابوں کے'' اردو شاعری میں ایک خوبصورت اور باوقار اضافہ ثابت ہوگی اور قاری کو اور یقیناً شاعری پڑھنے کو ملے گی کیونکہ آج کل شاعری تو بہت ہو رہی ہے مگر صحیح معنوں میں شعر اور تخلیق کا حق کوئی کوئی ادا کر رہا ہے۔

☆☆☆☆☆

مذہب اور مارکسزم [بقیہ حصہ]

طاہر شبیر

اسلام اور مارکسزم

اسلام میں ریاست کا تصور: عہد مصطفویؐ میں اسلامی ریاست دو مدارج سے گزرتی ہے:

(1) اوّل میثاق مدینہ سے فتح خیبر تک

(2) دوئم فتح خیبر سے فتح مکہ تک

میثاق مدینہ بڑی اہم تاریخی دستاویز ہے۔ اس کی پہلی شرط خدا کی وحدانیت اور رسولؐ اکرم کی نبوت کا اقرار تھی۔ یہ محمد رسولؐ اللہ کی تحریر ہے ماننے والوں اور قریش اور یثرب کے مسلمانوں کے درمیان اور جو اُن کے حلیف ہیں اور اُن سے مل کر جہاد کرتے ہیں وہ ایک واحد اُمت ہیں دوسروں سے جدا۔

اس میثاق کی روح سے مدینہ کے یہودی بھی اُمت میں شامل تھے۔ بنوعوف کے یہودی مسلمانوں کے ساتھ اُمت ہیں۔ یہودیوں کا دین اُن کے لیے اور مسلمانوں کا دین اُن کے لیے۔ یہودی چونکہ وحدانیت پرست تھے لہٰذا آنحضرتؐ کو یہودیوں کو جو مدنی معاشرہ کا اہم جز تھے اُمت کا رُکن قرار دینے میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہوئی۔

اس معاہدے کی روح سے باہمی اختلافات کے بارے میں طے پایا کہ اگر تم میں سے کسی چیز کی بابت اختلاف ہو تو خدا اور محمدؐ

سے رجوع کرو۔ مزید وضاحت یوں کی گئی کہ جب کبھی اس دستاویز کے لوگوں کے مابین کوئی فساد اُٹھ کھڑا ہو یا ایسا جھگڑا پیدا ہو جس سے تباہی کا اندیشہ ہو تو اللہ اور محمد رسول اللہ سے رجوع کیا جائے۔

امن و عافیت کی بنیادوں کو مزید مستحکم کرنے کی غرض سے یہ شرط رکھی گئی ہے کہ اُمت کا کوئی فرد محمد رسول اللہ کی اجازت کے بغیر جنگ میں شریک نہیں ہوگا۔

ہر چند کہ اس دستاویز کی رُو سے اہلِ مدینہ آنحضرتؐ کی اطاعت کے پابند نہیں ہوئے اور نہ سرادرانِ قبیلہ کے حقوق و اختیارات پر کوئی اثر پڑا لیکن یہ معاہدہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ معاہدہ کرنے والوں نے آنحضرتؐ کی سیاسی قیادت کی جانب پہلا قدم تھا۔

میثاقِ مدینہ کے بعد جنگِ بدر 2ھ ایک فیصلہ کن موڑ ہے جہاں پہنچ کر مدنی ریاست کی تخم ریزی کے لیے زمین ہموار ہوتی ہے مالِ غنیمت سارے کا سارا مہاجرین میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے اب اُن کو انصار کی مالی مدد کی ضرورت نہیں رہتی۔ چند ہی ہفتوں کے اندر بنو قینوقاع کو مدینہ سے نکال دیا جاتا ہے۔ وہ مدینہ کے سب سے بڑے بازار پر قابض تھے۔ اُن کے شہر بدری کے بعد تجارت پیشہ مہاجروں کو مزید سہولتیں حاصل ہو جاتی ہیں اور انصار بھی جو بنی قینوقاع کے مقروض تھے قرضوں سے بَری ہو جاتے ہیں۔

ایک سال کے بعد بنو نضیر کے اخراج اور پھر بنو قُریظہ کے قتلِ عام کے بعد یہودیوں کے کھیت کے نخلستان آنحضرتؐ کی تحویل میں آ جاتے ہیں (بطور فے)۔ آنحضرتؐ ان زمینوں کو مہاجرین اور چند حاجت مند انصار میں تقسیم کر دیتے ہیں اب مدینہ خالص مسلمانوں کا شہر ہے۔

مدینے کے قرب و جوار کے صحرانشینوں سے امن و امداد باہمی کے معاہدے کیے جاتے ہیں اور آنحضرتؐ کے سفیر ایران، مصر، قسطنطنیہ، یمن اور غسان کو اسلام قبول کرنے کا پیغام لے کر روانہ ہوتے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ خطوط اللہ کے رسول محمدؐ کی جانب سے ہیں۔ ان خطوط میں نہ تو کسی ملک کی طرزِ حکومت پر اعتراض کیا گیا ہے اور نہ کسی کو مخصوص طرزِ حکومت قائم کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔

پھر خیبر فتح ہوتا ہے جو شمال میں یہودیوں کی بستی تھی۔ علامہ شبلی نعمانی کے بقول یہ پہلا غزوہ ہے جس میں غیر مسلم رعایا بنائے جاتے ہیں اور طرزِ حکومت تک کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔ اسلام کی ملکی اور سیاسی حالت کا نیا دور شروع ہوا (سیرۃ النبیؐ ___ 480 تا 500)۔ خیبر میں چونکہ مسلمان آباد نہ تھے اور نہ مسلمان وہاں بسنے پر راضی تھے۔ لہٰذا

آنحضرتؐ نے وہاں کے نخلستانوں اور زمینوں کو بٹائی پر یہودیوں کے حوالے کر دیا۔ مورخین کا خیال ہے کہ ان زمینوں کو فے قرار دیا گیا تھا یعنی مسلمانوں کی اجتماعی اور مشترکہ ملکیت (ریاست کی ملکیت)۔ پیداوار کے تیار ہونے پر آنحضرتؐ کسی صحابی کو نصف پیداوار وصول کرنے کے لیے بھیج دیتے تھے۔ (سیرۃ النبیؐ جلد دوم صفحہ 82 مرتبہ علامہ سیّد سلیمان ندوی) فتح مکہ کے بعد مدنی ریاست کی تشکیل مکمل ہوئی۔

اگرچہ اس نوزائیدہ ریاست کے پاس رعایا سے الگ اور بالا نہ کوئی فوج تھی نہ پولیس، نہ بڑے بڑے انتظامی دفاتر، نہ کثیر التعداد عہدے دار، نہ وزراء نہ امرائے ریاست، نہ شوریٰ نہ الگ الگ حکام وقضاۃ۔ مگر ریاست کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

یہ ریاست نوعیت کے اعتبار سے شہری ریاست تھی۔ یعنی عرب کا تقریباً چوتھائی علاقہ اگرچہ ریاست کے تابع تھا لیکن سیاسی اختیارات، حقوق اور مراعات کا مرکز شہر مدینہ تھا۔ طرز حکومت کے لحاظ سے یہ ریاست تھیوکریسی تھی یعنی ریاست کا حاکم اعلیٰ خدا کا رسولؐ تھا جو تعلیمات قرآنی کی روشنی میں احکام صادر کرتا تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اسلام کا مقصد ریاست قائم کرنا تھا۔ کیا خدا کسی مخصوص ریاستی نظام کو درست اور بقیہ کو نادرست سمجھتا ہے اور کیا آنحضرتؐ دنیا میں تھیوکریسی قائم کرنے بھیجے گئے تھے۔

تاریخ ان سوالوں کا جواب نفی میں دیتی ہے اور عقل اس نفی کی تائید کرتی ہے۔ خدا کو اس سے کوئی سروکار نہیں کہ کسی ریاست کا نظام شاہانہ ہے، آمرانہ ہے، جمہوری ہے یا اشتراکی۔ اگر خدا کی مرضی یہ ہوتی کہ فلاں نظام ریاست رواج پائے تو انسان کو ابتدا ہی میں اپنی مرضی سے آگاہ کر دیتا اور پچھلے چھ ہزار سال سے تھیوکریسی، ملوکیت، آمریت، جمہوریت اور اشتراکیت کے جو تجربے ہو رہے ہیں اُن کی ضرورت ہی نہ پیش آتی۔

قرآن میں بادشاہتوں کے تذکرے ہیں مگر ریاست جیسے اہم مسئلہ پر قرآن بالکل خاموش ہے۔ خدا نے انسان کو اس بات کی مکمل آزادی دے دی ہے کہ وہ جس طرز کی ریاست یا حکومت چاہے قائم کرے۔

آنحضرتؐ نے مختلف فرمانرواؤں کو جو خطوط لکھے اُن میں بھی فقط اسلام کی دعوت دی گئی طرز حکومت کا ذکر نہیں کیا گیا۔

بعثتِ نبویؐ کا مقصد بیان کرتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں۔

آنحضرتؐ کی بعثت کا مقصد دعوت مذہب، اصلاحِ اخلاق اور تزکیۂ نفس تھا۔ اس کے علاوہ تمام فرائض محض ضمنی تھے۔ اس بنا پر انتظامات ملکی آپؐ نے اُسی حد تک قائم کیے

جہاں تک ملکی بدامنی کے باعث دعوت توحید کے لیے عوائق پیش آتے تھے۔

سرزمینِ حجاز میں ریاست کا ظہور وہاں کے سیاسی اور معاشرتی حالات میں تبدیلیوں کا منطقی نتیجہ تھا۔ مدنی ریاست رفتہ رفتہ اُنھی تاریخی عوامل کے بروئے کار آنے سے وجود میں آئی جن کے باعث بعض اوقات چھوٹی چھوٹی بستیاں شہروں میں اور شہر شہری ریاستوں میں تبدیل ہو گئے۔ یہ تبدیلیاں کسی فرد واحد کی خواہش کی مرہونِ منت نہ تھیں۔ بل کہ معاشرتی حالات ان کا سبب بنے تھے۔

آنحضرتؐ نہ ریاست قائم کرنے کے آرزومند تھے نہ انھوں نے ریاست قائم کرنے کا منصوبہ بنایا اور نہ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جدوجہد کی۔ البتہ مدینے کے حالات ہجرتِ نبویؐ کے بعد ایسی صورت اختیار کرتے چلے گئے کہ ریاست کا قیام ناگزیر ہو گیا۔

سیّد سبط حسن اپنی کتاب ''نویدِ فکر'' میں پروفیسر قمر الدین خاں (جو بڑے عالم و فاضل بزرگ تھے) کے ایک مضمون کا حوالہ دیتے ہیں جو اُنھوں نے روزنامہ ڈان کراچی کی 14 اگست 1980 کی اشاعت خاص میں لکھا تھا، جس کا عنوان تھا۔

''اسلام ایک معاشرہ ہے نہ کہ سیاسی نظام''

اس مقالہ میں اُنھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام کا مقصد ریاست قائم کرنا نہیں تھا اور نہ قرآن مسلمانوں کو اسلامی ریاست قائم کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ ذیل میں ہم پروفیسر صاحب کے مضمون کا خلاصہ اُنھی کے الفاظ میں پیش کرتے ہیں تاکہ اسلامی ریاست کی اصل حقیقت واضح ہو جائے۔

(1) فلسفۂ سیاست کا بنیادی تصور ریاست ہے۔ دوسرے تمام سیاسی خیالات براہ راست یا بالواسطہ اسی سے منسلک ہیں لیکن قرآن میں ریاست کا کوئی تفصیلی یا اجمالی نظریہ موجود نہیں ہے۔

(2) قرآن نے دراصل کسی اصول ریاست کی تشریح نہیں کی ہے۔ قرآن میں کسی جگہ نہ دستور کا تصور ملتا ہے، نہ اقتدارِ اعلیٰ کا تصور، حق رائے دہی کا اصول، نہ انسانی حقوق کا تفصیلی تصور، اور نہ ریاستی اداروں اور تنظیموں کے ضابطے۔ قرآن شریف ان تمام موضوعات پر خاموش ہے کیونکہ تاریخی ارتقا کے ساتھ ان کے معنی و مفہوم بدلتے رہتے ہیں۔ مزید برآں قرآن کا مقصد ریاست قائم کرنا نہیں بل کہ معاشرے کی تخلیق ہے۔

(3) ریاست اور آئین کی تعریف کی عدم موجودگی (قرآن میں) مسلمانوں کے لیے بڑی وجہ خیر ہے کیونکہ اس کے باعث اسلام کے لیے زمانے کی ترقی کے ساتھ قدم ملا کر چلنا اور نئے حالات اور نئے

ماحول کے ساتھ مطابقت کرنا ممکن ہے۔

(4) قرآن میں اختیار اور اقدار کا ذکر مختلف تناظر میں بار بار آیا ہے لیکن نہ تو ریاست کی کہیں تعریف کی گئی ہے نہ مثالی ریاست کی۔

(5) سنّت بھی اس موضوع پر قرآن ہی مانند خاموش ہے۔ اسی سے پتہ چلتا ہے کہ پیغمبر خدا کے فوری جانشینوں نے سیاسی تنظیم کے مختلف اصول کیوں اختیار کیے۔

(6) قرونِ اولیٰ ریاست کے بارے میں کبھی قیاس آرائی نہیں کی گئی۔ نظریہ سازی درحقیقت عباسیوں کے ابتدائی دور میں شروع ہوئی اور خلافت کا تمام تصور غیر معتبر احادیث اور بعد کے تاریخی واقعات کی بنیاد پر قائم ہوا، اور بعد میں خلافت کا جو نظریہ وضع ہوا اُس کا کوئی تعلق قرآن سے نہ تھا۔ وہ سیاسی مصلحت اور مذہبی ضرورت کی پیداوار تھا۔ یہ تمام نظریات دورِ ملوکیت میں ایجاد ہوئے۔

(7) قرآن کی غلط ترجمانی اسلامی تاریخ کی روایت ہے، چنانچہ دورِ حاضر میں بھی بعض علماء دین قرآن کی اِکّا دُکّا آیتوں کو اُس کے اصلی سیاق و سباق سے الگ کر لیتے ہیں اور اُن سے اُن خیالوں اور اداروں کی تائید کا کام لیتے ہیں، جن سے اُن کا کوئی تعلق ہو۔

(8) ان دنوں احیاء دین کے بجائے سارا زور اسلامی ریاست قائم کرنے پر دیا جا رہا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ اسلامی ریاست کا قیام پہلے ضروری ہے تاکہ دین کا احیا ہو سکے۔ یہ کوشش بھی کی جا رہی ہے کہ ریاست کو دین کے برابر گردانا جائے۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ خود خدا نے جس کام کو مناسب نہ جانا اُس پر اتنی محنت کیوں کی جا رہی ہے۔ خدا کے لیے بہت آسان تھا کہ وہ ریاست کے اصول اور ڈھانچے کا ذکر تفصیل سے بیان کر دیتا اور مسلمانوں کو بے شمار خونی جھگڑوں اور پریشانیوں سے بچ لیتا لیکن بنے ماننے والوں کو ہمیشہ کے لیے کسی مخصوص سیاسی ڈھانچے کا پابند کر دینا حکمت خداوندی کے خلاف تھا۔ مزید برآں اسلام کا مقصد ریاست قائم کرنا نہ تھا بل کہ ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا تھا جس کی قدر کی تشریح کر دی گئی۔

(9) ریاست معاشرے کے مناصب میں سے ایک منصب ہے اور چونکہ معاشرہ وقت کے ساتھ بدلتا اور ارتقا مدارج طے کرتا رہتا ہے لہٰذا ریاست کی فطرت اور ہیئت بھی اس کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ یہ تھی اصل وجہ جس کی بنا پر قرآن نے ریاست کے اصول منضبط نہیں کیے اور مسلمانوں کو اس بات کی پوری آزادی دے دی کہ وقت اور زمانہ کی مناسبت سے جس معاشرے کے لیے جس قسم کا سیاسی ڈھانچہ چاہیں وضع کر لیں۔ یہی

وجہ ہے کہ ہمارے بڑے بڑے علماء دین مثلاً امام شافعی، امام یوسف، امام محمد، امام غزالی اور ابن تیمہ وغیرہ نے موروثی سلطانوں کی ملازمت کی اور غیر اسلامی ریاست کی خدمت کرنے پر احتجاج نہیں کیا۔ اس کے برعکس ان میں سے اکثر ریاستوں سے بڑے سرگرم حامی تھے کیونکہ اس وقت کے حالات میں کوئی بہتر صورت ممکن نہ تھی۔

(10) کہا جاتا ہے کہ پیغمبروں کا خاص مقصد زمین پر قوانین الٰہی کے مطابق سیاسی اقتدار قائم کرنا تھا۔ اگر یہ دعویٰ صحیح ہے تو بیشتر انبیاء اپنے مشن میں ناکام رہے۔ سچ تو یہ ہے کہ قرآن میں جن نبیوں کا ذکر موجود ہے اُن میں سے کسی کو بھی یہ ہدایت نہیں کی گئی کہ تمھارا منصب وفریضہ دنیا میں اسلامی ریاست قائم کرنا ہے۔ وہ لوگوں کو فقط کائنات کے خلق اور ربّ کی عبادت کی دعوت دیتے ہیں اور نیک کام کرنے اور بدی سے بچنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ آنحضرتؐ اور اہل مکہ میں نزاع کا اصل سبب یہ نہ تھا کہ آنحضرتؐ وہاں پر کوئی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے بل کہ اُنھوں نے اہل مکہ کے عقیدۂ بت پرستی کو رد کیا تھا۔ قرآن نے آنحضرت کے مشن کو بار بار وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔

(11) کہا جاتا ہے کہ ریاست میں حاکمیت کا مستحق صرف خدا ہے نہ کہ ریاست کے باشندے۔ مگر ظاہر ہے کہ خدا خود زمین پر آ کر فیصلے نہیں کرے گا بل کہ فیصلے انسان ہی کریں گے۔ البتہ دعویٰ یہ کریں گے کہ یہ فیصلے مقدس ہیں کیونکہ خدا کے نام پر کیے گئے ہیں۔ مگر اسلامی تاریخ میں بدترین قسم کا استبداد اسی طور پر نافذ ہوا ہے۔

پروفیسر قمر الدین خاں کے مضمون کا خلاصہ

(1) قرآن اور احادیث میں مسلمانوں کو ریاست قائم کرنے کی ہدایت کہیں درج نہیں ہے۔

(2) قرآن اور سنت میں آئین، قانون یا سیاسی نظریہ کا کوئی اصول موجود نہیں ہے۔ رسولِ مقبول نے سیاسی حکومت ضرور قائم کی مگر وہ تاریخی صورتِ حال کا نتیجہ تھی۔ اُن کے پیغمبرانہ مشن کا بنیادی مقصد نہ تھی۔

(4) اسلامی سیاسی نظریے قرآن اور سنت پر مبنی نہیں ہیں۔ بل کہ صحابہ کرام کی آرا اور خلفاء راشدین کے عمل سے ماخوذ ہیں اور تاریخی حالات کا نتیجہ ہیں۔ لہٰذا اُن کو کوئی مذہبی سند حاصل نہیں۔

(5) ریاست معاشرے کے مناصب میں سے ایک ہے اور ہمیشہ ضروری نہیں ہے۔ ہجرت سے قبل مکہ میں کوئی ریاست نہ تھی مگر مسلمان موجود تھے۔ لہٰذا اسلامی معاشرہ ریاست کے بغیر کام کر سکتا ہے۔ ہندوستان، سویت یونین، تھائی لینڈ، فلپائن

اور متعدد افریقی ملکوں میں مسلمان بڑی تعداد میں موجود ہیں۔

(6) یہ دعویٰ کہ اسلام مذہب اور سیاست کا آہنگ ہے، جدید تصور ہے اسلام کی تاریخ میں جس کا سراغ نہیں ملتا اسلامی تاریخ میں ''اسلامی ریاست'' کی اصطلاح بیسویں صدی سے پہلے کبھی استعمال نہیں ہوئی۔

پروفیسر قمرالدین خاں کے اس مضمون سے اسلام میں ریاست کا تصور واضح ہو جاتا ہے۔ لیکن ہماری نام نہاد اسلامی جماعتیں قرآن اور حدیث سے اپنے مطلب کے ریاستی نظریے ہی اخذ نہیں بل کہ قرآن کی بعض آیتوں کو سیاق و اسباق سے الگ کر کے اُن سے حاکم وقت کی اطاعت کا جواز بھی ثابت کرتی ہیں۔ آیات قرآنی کا یہ بے جا استعمال بنو امیہ اور بنو عباس کے دور میں شروع ہوا اور آج تک جاری ہے۔

مثلاً امام غزالی (1058ء - 1111ء) جیسا کہ عالم دین جب آیات قرآنی کے ساتھ یہی ناانصافی کرتا ہے تو حیرت ہوتی ہے۔ نصیحت الملوک اُن کی آخری تصانیف میں شمار ہوتی ہے۔ کتاب کے حصہ دوم میں امام صاحب مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''تم کو جاننا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اولادِ آدم میں سے دو طبقے منتخب کیے اور اُن کو بقیہ بندوں پر فوقیت عطا کی اوّل انبیاء دوم سلاطین۔''

اپنے بندوں کو معبود کی طرف رجوع کرنے کے لیے انبیاء بھیجے اور بندوں کی حفاظت کے لیے سلاطین بھیجے، سلطان زمین پر خدا کا سایہ ہے لہٰذا یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ سلطانی سلطانوں کو خدا نے مرحمت کی ہے لہٰذا اُن کی اطاعت کرنی چاہیے۔ اُن سے محبت کرنی چاہیے اور اُن کا حکم ماننا چاہیے۔ سلاطین سے جھگڑا کرنا درست نہیں اور اُن سے نفرت کرنا غلط ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے۔

اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واُولی الامر منکم۔

حالانکہ سورۃ النساء کی اس آیت کا حکم وقت کی اطاعت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

ابوالحسن علی ابنِ احمد الواحدی وفات (467ھ / 1075ء) اپنی مشہور کتاب ''اسباب النزول'' میں اس آیت کی شانِ نزول کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ یہ آیت عبداللہ بن حذیفہؓ کے باب میں نازل ہوئی۔ پیغمبرؐ نے اُنھیں ایک مہم پر بھیجا تھا۔

ابن عباسؓ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ پیغمبرؐ اسلام نے خالدؓ بن ولید کو ایک مہم پر بھیجا۔ عمارؓ بن یاسرؓ اُن کے ہمراہ تھے۔ عمارؓ نے ایک عرب کو پناہ دی جو اُسی وقت مسلمان ہوا تھا۔ خالدؓ بن ولید نے اُس کو گرفتار کر لیا اور اُس کی جائیداد ضبط کر لی۔ عمارؓ کو معلوم ہوا تو

اُنھوں نے خالدؓ سے کہا یہ شخص مسلمان ہوگیا ہے اور میں نے اس کو پناہ دی ہے لہٰذا اس کو رہا کردو۔ خالدؓ نے عمارؓ کو ڈانٹا اور کہا تم لشکر کے سالار نہیں ہو لہٰذا تم کو پناہ دینے کا حق نہیں۔ مہم سے واپس آکر دونوں نے یہ روداد آنحضرتؐ کو سنائی تو آپؐ نے عمارؓ بن یاسر کے حق میں فیصلہ دیا اور نومسلم کو پناہ دینے کو درست قرار دیا۔ لیکن یہ حکم بھی صادر فرمایا کہ سالار لشکر کی اجازت کے بغیر کسی کو پناہ نہ دی جائے۔

فوجی مہم کے دوران سالار لشکر کے احکام کی اطاعت نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ آج بھی افسر کی حکم عدولی فوجی قوانین کے تحت نہایت سنگین جرم خیال کی جاتی ہے۔ لیکن اس آیت کو تاریخی پس منظر سے جدا کر کے اُس سیاسی کلیے کی بنیاد بنانا بڑی اخلاقی بددیانتی ہے۔ امام غزالیؒ نے 'اطیعوا الامر'' کا جو مفہوم پیش کیا وہ اس لحاظ سے لائق درگزر ہے کہ گیارھویں صدی عیسوی میں ملوکیت کے علاوہ کسی دوسری طرز حکومت کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن مولانا ابوالاعلیٰ مودودی بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں جب جمہوریت کا دور ہے اس آیت کی تشریح فرماتے ہوئے یہ فقیہانہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ آیت اسلام کے پورے مذہبی، تمدنی اور سیاسی نظام کی بنیاد ہے اور اسلامی ریاست کے دستور کی اوّلین دفعہ ہے تو عقل تسلیم نہیں کرتی کہ جس شخص نے قرآن کا ترجمہ مع تفسیر کیا ہو وہ اس آیت کی شان نزول سے واقف نہ ہو اور جس آیت کا کوئی تعلق اسلام کے مذہبی، تمدنی اور سیاسی نظام سے نہیں اُس کو وہ اسلامی ریاست کے دستور کی اوّلین دفعہ قرار دے، فریب خوردہ اور فریب کار ذہنیت کی اس سے بُری مثال مشکل سے ملے گی۔

عباسیوں کے دور حکومت میں تو ایسی حدیثیں بھی گھڑلی گئیں جن سے حاکم وقت کی اطاعت مذہباً واجب قرار پائے۔ چنانچہ مولانا مودودیؒ نے امام بخاری کی کتاب الاحکام کے حوالے سے اس حدیث کو اپنے موقف کی تائید میں پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ حدیث میں ارشاد ہوا۔

اسمعوا واطیعوا ولو استعمل علیکم عبد حبشی۔

''سنو اور اطاعت کرو اگرچہ تمھارا سردار ایک حبشی ہی کیوں نہ بنا دیا جائے۔'' اس طرح انگریزوں کی غلامی بھی جائز تھی۔

اسلام اور سرمایہ دار: اور مت دُور کر ان لوگوں کو جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح اور شام، چاہتے ہیں اُس کی رضا، تجھ پر نہیں ہے اُن کے حساب میں سے کچھ اور نہ تیرے حساب میں سے ان پر ہے کچھ کہ تو ان کو دور کرنے لگے۔ پس ہو جاوے گا تو بے انصافوں میں سے۔

(سورۃ الانعام۔ آیت نمبر 52)

کافروں کے بعض سرداروں نے حضرت محمدؐ سے کہا کہ تمھاری بات سننے کو ہمارا دل چاہتا ہے لیکن تمھارے پاس بیٹھنے والے رذیل لوگ ہیں ہم اُن کے برابر نہیں بیٹھ سکتے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ''یعنی خدا کے طالب اگرچہ غریب ہیں، اُن ہی کی خاطر مقدم ہے'' لہٰذا آپؐ دولت مندوں کے کہنے پر ان غریب اور مخلص لوگوں کو اپنے پاس سے ہٹانے لگیں گے تو یہ بات بے انصافی کی ہوگی۔ (تفسیر عثمانی)

قرآن کی اس آیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا خدا بھی سرمایہ داروں کے خلاف ہے اور غریبوں سے محبت کرتا ہے۔ اسلام کا جو خدا سرمایہ داروں کو پسند کرتا ہے وہ مولوی یا مولانا مودودی کا خدا تو ہوسکتا ہے۔ وہ نبیؐ اکرم یا صحابہ کرام کا خدا ہرگز نہیں ہے۔ اسلام کا خدا مسلمانوں کو دولت جمع کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دیتا جیسا کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:

''اے نبیؐ یہ پوچھتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں کیا خرچ کریں تو کہہ دیجیے جو تمھاری ضرورت سے زیادہ ہے۔''

نبیؐ اکرم نے تو ساری عمر اس فرمان پر عمل کیا لیکن کیا آج کے مُلّاں جو اپنے آپ کو دین کا ٹھیکیدار سمجھتے ہیں اللہ کے اس فرمان پر عمل کرتے ہیں؟

یہ لوگ بڑی بڑی کوٹھیوں میں رہتے ہیں اور بڑی بڑی گاڑیوں میں پھرتے ہیں۔ جبکہ نبیؐ اکرم کے فقر کا یہ عالم تھا کہ انھیں کبھی زکوٰۃ دینی ہیں نہیں پڑی کیونکہ آپؐ صاحبِ نصاب ہی نہیں ہوئے۔

آپؐ کی وفات کے بعد جب حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ بنے تو اُن سے اُن کی تنخواہ کے بارے میں پوچھا گیا جس پر اُنھوں نے فرمایا کہ مدینے میں جو ایک مزدور کی اُجرت ہے میں وہی اُجرت لوں گا۔ اس پر لوگوں نے پوچھا کہ کیا اس اُجرت میں آپ کا گزارہ ہو جائے گا تو حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا اگر گزارہ نہ ہوا تو میں مزدور کی مزدوری بڑھا دوں گا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ضروریات زندگی بادشاہ اور مزدور دونوں کی برابر ہوتی ہیں۔ ''یہی مارکسزم کی منزل ہے کہ ہر ایک سے اُس کی اہلیت کے مطابق کام لو اور اُس کی ضرورت کے مطابق معاوضہ دو تاکہ سماج میں معاشی ناانصافی کا خاتمہ ہوسکے۔''

حضرت عمرؓ جو بائیس لاکھ مربع میل کی سلطنت کے حکمران تھے لیکن کیا کبھی اُنھوں نے قیمتی لباس پہنا؟ حضرت عمرؓ کے دور میں ریاست کے ہر شہری کا وظیفہ مقرر تھا جو بیت المال سے دیا جاتا تھا ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے مدینے کی گلیوں میں گشت کے دوران ایک بچے کے رونے کی آواز سنی تو اس کی وجہ پوچھی۔ بچے کی ماں نے بتایا کہ میں نے اسے دودھ نہیں پلایا کیونکہ جو بچے ماں کا

دودھ پیتے ہیں اُنھیں خلیفہ کی طرف سے وظیفہ نہیں ملتا۔ یہ سننے کے بعد حضرت عمرؓ نے شیر خوار بچوں کا بھی بیت المال سے وظیفہ مقرر کر دیا۔ یہی وہ ریاست ہے جو شہریوں کی ہر طرح کی ذمہ دار ہوتی ہے۔

اسی طرح اسلام زمینوں کی ذاتی ملکیت یا جاگیریں عطا کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ خلفائے راشدین سے لے کر مغلیہ دور تک اسلام میں زمینوں کی مستقل الاٹمنٹ کی مثال نہیں ملتی۔ زمین اور جاگیریں حکمرانوں کی مرضی سے دی جاتی تھیں اور جیسے ہی حکمران تبدیل ہوتے تھے جاگیریں بھی چھین کر اپنے من پسند افراد کو دے دی جاتی تھیں۔ یہ زمینیں لوگوں کے پاس عارضی طور پر ہوتی تھیں اور اُن کی پیداوار میں ریاست کا حصہ ہوتا تھا جو ریاست کے کارندے باقاعدگی سے وصول کرتے تھے۔ اُس زمانے میں زمین ہی ذریعہ پیداوار ہوتی تھی اور اس کی آمدن سے ہی ریاست کے اخراجات پورے ہوتے تھے۔

زمینوں کی مستقل الاٹمنٹ انگریزوں نے 1793 میں بنگال سے شروع کی جو انگریزوں کے پورے برصغیر پر حکمران بننے کے بعد سارے ہندوستان میں پھیل گئی اس طرح ہمارے ہاں جو بڑے بڑے جاگیردار ہیں انھیں یہ جاگیریں انگریزوں نے ان کے آبا و اجداد کی وفاداریوں کے بدلے میں عطا کی تھیں۔ یہ ان کی محنت یا حلال کی کمائی سے خریدی ہوئی جاگیریں نہیں ہیں۔ ہندوستان کی حکومت نے تو آزادی کے شروع میں ہی جاگیریں ختم کر دی تھیں لیکن پاکستان میں یہ جاگیرداری نظام بدقسمتی سے آج بھی موجود ہے بل کہ پہلے سے بھی زیادہ مضبوط ہے کیونکہ آج کا جاگیردار صنعت کار اور سرمایہ دار بھی بن چکا ہے۔ اس جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام کو صرف اور صرف مارکسزم ہی ختم کر سکتا ہے۔ مارکسزم کے علاوہ دنیا کا کوئی نظام یہ انقلاب برپا نہیں کر سکتا۔

مارکسزم کیوں، خلافتِ راشدہ کیوں نہیں؟

جب ہماری علمائے دین اور اسلامی خلافت کے حمایتی لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے تو وہ یہی کہتے ہیں کہ آپ مارکسزم کے لیے کیوں جدوجہد کرتے ہیں مگر خلافت کے لیے کیوں کوشش نہیں کرتے تو ہمارا اُنھیں یہی جواب ہوتا ہے کہ خلافتِ راشدہ جیسے سنہری دور سے ہمارا کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن یہ دور نبیؐ اکرم کے تیس سال بعد ختم ہو گیا تھا۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کا دو سال اور پانچ ماہ کا دور ہے جو خلافتِ راشدہ جیسا ہی تھا۔ اس کے علاوہ اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں کوئی ایسا دور نظر نہیں آتا جس کو ہم اسلامی نظامِ حکومت کہہ سکیں۔ سب بادشاہتیں ہی نظر آتی ہیں اور ان بادشاہتوں

میں وہ تمام خامیاں موجود تھیں جو بادشاہوں میں ہوا کرتی ہیں۔
اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں خلافتِ راشدہ والا نظام قائم کروں گا تو وہ جھوٹ بولتا ہے اور خلفائے راشدین کی توہین کرتا ہے کیونکہ قیامت تک اب خلفائے راشدین جیسے متقی لوگ پیدا نہیں ہوں گے۔ اس لیے ہم وہ کام کرنے کی کوشش کیوں کریں جو ناممکن ہے ہم مارکسزم کے لیے کوشش کیوں نہ کریں جو انسانوں کے مذہبی طور پر متقی و پرہیز گار ہوئے بغیر اُن کے معاشی سیاسی اور سماجی مسائل کا بہترین حل پیش کرتا ہے۔ کیونکہ مذہبی طور پر متقی اور پرہیز گار ہونا انسان کا ذاتی معاملہ ہے ریاست کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔
اب تک ہم نے مختلف مذاہب کا سرمایہ داری، جاگیرداری اور اشتراکیت کے بارے میں جائزہ پیش کیا ہے۔ آیئے اب ہم مارکسسٹوں کی مذہب کے بارے میں رائے کا جائزہ لیں۔
لینن اور مذہب: ہم ہر قیمت پر پرولتاریہ کی یکجہتی کی سائنسی توجیہہ پیش کرتے ہوئے سکون، استقلال اور صبر سے حکمرانوں کی مذہبی بنیاد پرستی کو فروغ دینے کی حکمت عملی کی مخالفت کریں گے۔ ایسی تبلیغ جو دوسرے درجے کے اختلاف کو ابھارنے جیسی نہیں ہوگی جہاں تک ریاست کا تعلق ہے تو انقلابی پرولتاریہ مذہب کو ایک نجی معاملہ بنانے میں کامیاب ہوگا اور اس سیاسی نظام میں جس پر قرونِ وسطیٰ کی کائی نہیں ہوگی، پرولتاریہ معاشی غلامی کے خاتمے کی وسیع اور کھلی جدوجہد کرے گا۔
(وی آئی لینن ''سوشلزم اور مذہب 1905ء'')
لینن جو پہلے کامیاب مارکسسٹ انقلاب کے رہنما تھے اُن کے نزدیک مذہب انسان کا ذاتی معاملہ ہے۔ ریاست کو کسی کے مذہبی عقائد سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ کمیونسٹ ریاست لوگوں پر مذہبی پابندیاں عائد نہیں کرتی اور نہ اُنھیں کوئی مذہب اختیار کرنے سے روکتا ہے۔
ماؤزے تنگ اور مذہب: قدرت اللہ شہاب کہتے ہیں کہ ایک ملاقات میں جو میری بڑی کوششوں کے بعد ہو سکی، میں نے ماؤ سے پوچھا کہ آپ نے جو اپنی تحریک کو God Less رکھا کیا اس کا کوئی خاص مقصد تھا؟ وہ مسکرا کر بولے یہ سوال ہماری مجلس میں بھی اُٹھایا گیا تھا وہاں اختلاف رائے تھا کوئی کسی خدا کے حق میں تھا کوئی کسی اور کے۔ اس لیے فیصلہ ہوا کہ اس ایشو کا فیصلہ اگلی میٹنگ میں کیا جائے گا ہر کوئی اپنا مشورہ لکھ کر لائے۔ ماؤ نے کہا میں فلسفے کا طالب علم ہوں اور تمام مذہب کا مطالعہ کر چکا ہوں اس لیے میری دانست میں کمیونزم کے پیچھے اسلام کے خدا کے سوا کوئی خدا قائم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے

اس موضوع پر ایک مقالہ تیار کیا تھا تا کہ اسے اگلی مجلس میں پیش کر سکوں۔ پتہ نہیں کیسے ہمارے پروگرام کا انگریزوں کو علم ہو گیا۔ اُنھوں نے ہندوستان کو علمائے دین سے کمیونزم کے خلاف فتوے حاصل کیے۔ یہ فتوے بہت متشدد تھے۔ انھوں نے ان فتوؤں کو شائع کر کے لاکھوں ہینڈ بل ہوائی جہاز کے ذریعے گرائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب مجلس کی نشست ہوئی تو ہر رکن کی میز پر ہینڈ بل پڑا تھا لہٰذا میں مقالہ نہ پڑھ سکا۔

(تلاش، ممتاز، صفحہ نمبر 222)

کارل مارکس: کارل مارکس کی یہ پیشین گوئی تھی کہ اگر سرمایہ دارانہ طریقہ پیداوار کو دنیا نے نہ بدلا تو اس قدر کشت وخون ہوگا کہ عجب نہیں دنیا کا تہذیب وتمدن ہی ختم ہو جائے۔ اگرچہ یہ مسئلہ بھی بحث طلب ہے کہ آیا ہمارا تہذیب وتمدن اس قابل بھی ہے کہ اس کی تباہی پر کفِ افسوس ملا جائے۔ بہرحال جب انسان ہی فنا ہو گیا تو اچھی و بری تہذیب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس دنیا میں حوانیات کا نسبتاً صلح وآشتی سے رہنا اور نسلِ انسانی کا دیدہ ودانستہ ایک غلط سماجی نظام کا شکار ہو جانا قابل افسوس ہے۔ اس تباہی سے اگر کوئی نظام بچا سکتا ہے تو وہ سوشلسٹ نظام ہے۔

کمیونسٹ دہریہ نہیں ہوتا: یہ مضمون اُن لوگوں کے لیے لکھا گیا ہے کہ جو سرمایہ دار کے ایجنڈے پر عمل کرتے ہوئے لوگوں کو کمیونزم سے متنفر کرنے کے لیے کمیونسٹوں کو دہریہ قرار دیتے ہیں۔ ان لوگوں میں ہر مذہب کے مُلاں جو خود کو مذہب کا ٹھیکیدار سمجھتے ہیں اور مذہب کو اپنے ذاتی مفادات کے لیے استعمال کرتے ہیں، پیش پیش ہیں۔ اس مضمون سے ان پر واضح کیا گیا کہ کمیونسٹ دہریہ نہیں ہوتا۔ کسی بھی مذہب کا ماننے والا کمیونسٹ ہوسکتا ہے یا یوں کہیے کہ کوئی شخص کمیونسٹ ہوتے ہوئے، ہندو بھی ہوسکتا ہے، بدھ بھی، زرتشت بھی ہوسکتا ہے یا پھر یہودی، عیسائی اور مسلمان بھی ہوسکتا ہے اور دہریہ بھی ہوسکتا ہے، کیونکہ مذہب انسان کا ذاتی فعل ہے وہ جو چاہے مذہب اختیار کرے۔ اس کے لیے اسے مذہب کے ٹھیکیداروں سے کسی سرٹیفکیٹ کی ضرورت نہیں ہوتی یہ انسان اور خدا کا معاملہ ہے۔ اس لیے مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ میں کامریڈ بھی ہوں، کمیونسٹ بھی ہوں اور کسی مولوی سے اچھا مسلمان بھی ہوں۔

حوالہ جات

(1) حسن ناصر شہید از، میجر محمد اسحاق
(2) موسیٰ سے مارکس تک از، سیّد سبطِ حسن
(3) نوید فکر از، سیّد سبط حسن
(4) تفسیرِ عثمانی از، مولانا شبیر احمد عثمانی
(5) سوشلزم اور مذہب 1905 از، وی۔ آئی لینن
(6) تلاش از، ممتاز مفتی

☆☆☆☆☆

مہاندرے گواچن دا عذاب [محمد عاصم بٹ کے ناول 'دائرہ' کے تناظر میں]

دائرہ سانپ ہے

سانپ دائرہ ہے

شام گہری ہو چلی تھی۔ کیا دیکھتا ہوں۔ کمرے کے دروازے سے کوئی ساڑھے تین فٹ لمبا سیاہ سانپ رینگتا چلا آ رہا ہے پہلے تو آنکھ کا دھوکا لگا کہ محلے گلی اور گھر میں سانپ کہاں سے، پھر سوچا سانپ کہیں بھی در آتا ہے، دائرہ در دائرہ۔ یہ سوچتے وہ کمرے کی دہلیز پار کر کے ٹی وی ٹرالی کی طرف گھسا آ رہا ہے۔ میں پاؤں سمیٹ کر کاؤچ کے اوپر کھڑا ہو گیا بیوی بچوں اور چھوٹے بھائی قیوم کو اوپر اس کے کمرے میں آوازیں دینے لگا کہ سانپ گھر میں گھس آیا ہے، اپنے کمروں کو بند کر کے آگے کوئی ضرب لگانے والی چیز پکڑ کر کھڑے ہو جاؤ.....اس سے پہلے کہ سانپ بھاری بھرکم بیڈ کے نیچے چلا جاتا اسے گھیر کر اپنے درمیان لے آئے اور کاری ضربیں لگاتے مار دیا گیا۔ باہر کھلی جگہ پر مٹی ڈال کر دبا دیا گیا اور بھی لوگ آس پاس کے اس کا مدفن دیکھنے کو چلے آئے.....سو سانپ کہیں بھی آ سکتا ہے میں نے بعد میں اس حوالے سے ایک نظم بھی لکھی۔

دائرہ ناول بھی اپنے بھیتر ایک سانپ جیسا ڈر پالے ہوئے ہے، ساتھ ساتھ چلتا ہوا آگے نجانے کیا ہو جائے ڈر بھی تو سانپ ہے جو رنگ زرد کیے رکھتا ہے۔

یہ جو دھڑکو سا لگا رہتا ہے یہ سانپ ہے دائرہ ہے۔ ذرا سیاسی آنکھ کھول کر دیکھیں ہمارا تو ویسے ہی پاؤں سانپ کی دُم پر رہتا ہے۔ آئے روز یہاں دھماکہ وہاں دھماکہ، دہشت گردی، افسوس اور پھر وہی دائرہ۔ یہ دائرے یہ سانپ لہراتے رہتے ہیں کلاوے میں لینے کو۔

سانپ گوبر بھرے دابڑے میں، اُپلوں کی بوری میں گھر آ سکتا ہے اوپر اُڑتی چیل کے پنجے سے چھت پر بچھی چارپائی پر گر سکتا ہے۔ خیال سے شُوکتا ہوا بھی مجسم ہو جاتا ہے.....دیومالائی سانپ ہمارا دیوتا یا خدا بھی رہا ہے۔

تنویر قاضی

'دائرہ' لاہور کے مضافات اور شہری زندگی کا احاطہ کرتا ناول ہے جو مجھے ریاض شاہد کے ناول، ہزار داستان، کی یاد بھی دلاتا ہے وہاں بھی زیریں سطح کو مانسوں کی کتھا سنائی گئی تھی۔

خوف پانی کے نہ ہونے کا ہو یا ہوا کے مصفا نہ ہونے کا وہ ہمارے ساتھ ہمیشہ رہا اور نجانے کب تک ساتھ رہے گا 1983... میں کراچی میں رہائش پزیر تھا تب بھی پانی کی آنیاں جانیاں لگی رہتیں.....دائرہ کا پانی کیا کہانی سناتا ہے دیکھتے ہیں

''صحن کے بیچوں بیچ سرکاری نلکا لگا ہوا تھا، جس میں بس صبح تڑکے ہی چند گھنٹوں کے لیے پانی آتا.....تب آس پاس گھروں کے مکین بالٹیوں اور کنستروں سمیت اس پر ہلا بول دیتے،

آلودہ پانی کا خوف دریدوں میں سانپ سا ہے۔

''اس سے پرے سڑک کے دونوں اطراف میں شیشم اور جامن کے درختوں کی قطاریں تھیں۔ دو رویہ سڑک کے وسط میں سبز پٹی تھی جس پر چوکور آہنی جنگلوں کے اندر چھوٹے قد کے بوٹے لگے ہوئے تھے، جنھیں دن بھر گاڑیوں کا دُھواں اور ہر طرف دُھند کی طرح پھیلا گرد کا غلاف کمہلائے رکھتا.....یہ بوٹے مدتوں ننھی ننھی شاخوں کے ساتھ سیدھے کھڑے رہنے اور بلند ہونے کی کوشش کرتے اور آہستہ آہستہ مرجھا جاتے - انہیں ہوا کا سانس درست اور صاف رکھنے کے لیے اپنی بھینٹ دینا پڑتی ہے لیکن ہوا مسلسل زہر آلود ہو رہی تھی اور بہت گھٹے ہوئے سانس لینے لگی تھی.....

''لیکن میرے ذہن میں شک کا کالا کیمیکل کیوں پیدا ہو رہا ہے۔ سانپ جیسا زہریلا شک کا کالا کیمیکل..... مجھے اپنی بیوی کے فہم ہر شک ہے۔ مجھے اس بات پر شک ہو رہا ہے کہ وہ میری بیوی ہے.....ہے نا عجیب بات،،

خیر سے آج یعنی مورخہ 29 اکتوبر 2024 کو لاہور دنیا کا آلودگی میں نمبر ون شہر ہے۔ فضا کا حق ہے اسے آکسیجن میسر ہو کہ وہ مانسوں اور دوسرے روح رکھنے والوں کو بھی بہم پہنچائے۔ سموگ نے شہر کو لپیٹ میں لے رکھا ہے حیات ماسک میں چھپی ہانپتی ہے خوف زدہ ہے جیسے سامنے سانپ رینگتے ہوں۔

یہ ایک بہت منفرد اور اہم ناول ہے۔ محمد عاصم بٹ یقیناً صفِ اول کے ناول نگار ہیں فلمی زندگی اور لاہور کے شب و روز کو کم کم کیپچر کیا گیا سو انھوں نے اس کے جغرافیے کو فکشن کر کے بڑا کام کیا.....مرزا حامد بیگ نے بھی اپنے ناول، انارکلی، میں لاہور کی فلمی دنیا کی بربادی کا نقشہ کھینچا ہے یعنی نوحہ لکھا ہے جو شہر اور فلم و سینما و سٹوڈیوز کی

خونچکاں کہانی بیان کرتا ہے۔ دائرہ فکشن کی خوب صورتی تو ہے ہی ساتھ میں یہ ایک دستاویز بھی ہے ہمارے چہار اطراف پھیلے شیز وفرینیا کے خوابوں کے سرخابوں کے زخمی ہونے کی.....

سب سے گہرا اور پیور کردار امتیاز علی خاں کا ہے جو بناتے ہیں جوڑتے ہیں سکھاتے ہیں۔ تحقیق کے مطابق آواز کو موت نہیں آتی سو اگر کوئی روح ہے تو وہ آواز ہی ہے جسے سنبھالا استاد نے دے رکھا ہے اور راشد کی شکل میں ایک شبیہہ بھی چھوڑ گئے ہیں..... اس ناول کا اختتام بھی انھی پر ہوا لیکن اصل میں یہ آغاز ہے کہ سُر کا خاتمہ نہیں ہوتا.....

''امتیاز علی خاں تان پورہ گود میں رکھے گنگنا رہے ہیں'' بلم کی آس، جیا اداس، تڑپت ہوں ساری رین'' پھر آنسو ان کی آنکھوں سے ٹپکتے ہیں۔ ایک سرد آہ ان کی چھاتی کو چیرتی ہوئی باہر نکلتی ہے..... وہ سر جھکا لیتے ہیں..... بس تان پورے پر انگلیاں چل رہی ہیں، دریا کی لہروں جیسی خاموشی اور روانی ہے..... سارے میں شری کے سوز بھرے سُر بکھرے ہیں یا پھر تیز شور ہے غصیلی ہوا کا..... امتیاز علی خاں چپ ہیں لیکن کوئی پھر بھی گا رہا ہے..... ایک ہوک سی ہر طرف سے اُٹھتی ہے اور اس کا کلیجہ چیر کر رکھ دیتی ہے''

''اس کی آواز ہوا کے شور میں گم ہو گئی۔ اس کا پیر ایک ان دیکھے پتھر سے ٹکرایا..... وہ لڑکھڑایا..... خود کو سنبھالنے کی کوشش کی اور پھر دھپ سے منہ کے بل زمین پر آ رہا..... امتیاز علی خاں شری کے سوز بھرے سُروں میں تان لگا رہے تھے اور آنسو ان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گر رہے تھے''

موسیقی نے اس ناول کو بہت توازن میں رکھا اور امیر بھی کیا۔ موسیقی سے شغف رکھنے والا لکھاری ہی وریدوں بھیتر کرید کے سلسلوں میں دوسروں سے کہیں بہتر لکھ پاتا ہے۔ مجھے گارسیا..... میلان کندیرا..... بیدی..... محمود احمد قاضی..... اسلم سراج الدین اور محمد عاصم بٹ سروں میں بھیگے نظر آتے ہیں..... بلکہ یہاں تک کہا گیا ہے جو موسیقی سے رغبت نہیں رکھتا وہ مشکوک ہے۔ ماحول جو ناول کے ہیرو راشد کو ملا وہ دیکھتے ہیں۔

''صبح صبح پیٹی کھولتے تو کھرج کے سر پر سے اسپرنگ ہٹا لیتے۔ صرف پردہ دباتے۔ کھرج بولتا ''پتر آواز لگا'' وہ اسے اپنے ساتھ آواز لگانے کو کہتے ''ہر سُر پر دس منٹ ٹھہرنا ہے'' تنگ وہ اصرار کرتے ''منہ پورا کھول..... سُر بھرا ہوا اور بلکل سیدھا نکالنا ہے..... آں..... ہاں..... ذرا اونچا کر آواز کو..... آں..... یہ ایں کیا ہوا..... ٹیڑھا سُر ہے۔ اسے سیدھا کر..... آں، آں، چھاتی کا زور لگا..... تو نے ماہیے ٹپے گانے ہیں جو گلے پر زور لگاتا ہے؟

چھاتی سے آواز نکال اور سیدھا اوپر ناک تک جا..... ہاں اس طرح اور کھول اسے..... اور کھول''.....

ہمارے سبھی صوفیا جو سیکولر تھے اور سارنگی سارنگی تھے سروں کی بارش میں بھیگتے تھے دھمال میں رہتے مانسوں کو قریب کرتے۔

راؤنڈ دی کلاک ہیلوسینیشن زدہ منظر وریدوں میں سوا کھنڈر پیدا کرتا ہے خالی پن گھاؤ گھاؤ بھرتا ہے بھوک بے چہرگی..... بے لباسی..... بے گھری اطراف میں عفریت کی طرح پھیلتے ہیں..... آج ہر دوسرا بندہ شیزوفرینک ہے..... آصف مراد..... راشد..... امین گل ایک ہی بندے میں براجمان ہیں..... راشد فلموں کے کرداروں سے نہیں نکل پاتا اپنے خاندانی..... معاشرتی اور نفسیاتی پچھوکڑ کی بنا پر اور وہ استعارہ ہے سیارے کے پسپارے کا اس کے اکیلے پن کے شور کا اور ہجوم کی تنہائی کا۔

کچھ پرتیں اُلٹاتے ہیں ریفرنس کے لیے..... اداکار کا کرداروں میں ایکٹ کرتے ہوئے جبر دیدنی ہے جو اس کے چہرے بشرے کی زردی عیاں کر رہی ہے..... دولت آسائش اور بظاہر عیاشی کے بھیتر تشنج اس کے دردبست کو تلپٹ کر رہا ہے..... اس سے سوا تشدد کیا ہو سکتا ہے.....

''میں اپنے آپ پر اور اپنے آس پاس ہر شے پر شک کرتا ہوں..... یہ کوئی آسان کام نہیں ہے..... اداکاری کے پیشے نے مجھ میں یہ شک بھرا ہے۔ میں کوئی بھی بہروپ دھار کر کچھ بھی بن سکتا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں میں بڑا اداکار ہوں۔ ہر کردار کو زندہ کر کے پیش کر سکتا ہوں اور ہر نئے کردار میں اس طرح اپنے آپ کو گم کر لیتا ہوں کہ کوئی دوئی باقی نہیں رہتی..... میں وہ سبھی کچھ ہوں جو میں بن کر دکھاتا ہوں، جو میں پیش کرتا ہوں..... لیکن خود کیا ہوں..... اداکار کے ان بہروپوں کے پیچھے بھی کوئی چہرہ ہے یا نہیں''

''مجھے پتہ تھا ایسا ہی ہوگا.. میں تمہیں ہمیشہ سمجھاتی رہی کہ خود کو اتنا مائینس مت کرو''

''لیکن مجھے نورین سے بھی الجھن ہونے لگتی ہے۔ میں اس کا شوہر ہوں، اس کا بچہ تو نہیں..... جیسا بھی ہوں، مجھے اپنے آپ کا سامنا کرنا چاہیے۔ مجھے اتنی مہلت ملنی چاہیے کہ میں اپنے آپ سے شناسا ہو سکوں''

''وہ کہتی ہے کہ میں نے تقریر بھی کی تھی..... میں ہنستا ہوں..... مجھے اور بھی شک ہونے لگا ہے کہ ہو نہ ہو یہ تقریب میری شمولیت کے بغیر ہوئی تھی اور یہ کہ وہاں میری جگہ کوئی اور تھا..... مجھ سے تو ہجوم میں بات نہیں ہو پاتی، تقریر کہاں کروں گا''

''اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا..... کچھ

سنائی نہیں دے رہا..... اندھا خلا تھا..... جس میں وہ بے وزنی کی کیفیت میں لڑھکتا، چکر کھاتا، بھاگتا جاتا تھا اور چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا، میں امین گل نہیں ہوں'' میں امین گل نہیں ہوں..... میرا یقین کرو..... مجھ پر رحم کرو..... میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے..... میں راشد ہوں..... میں آصف ہوں..... نہیں..... نہیں..... میں آصف..... میں راشد..... کیمرے آف کر دو..... لائٹ آف..... شاٹ کینسل..... پیک اپ..... پیک اپ..... میں یہ شاٹ نہیں کروں گا..... میں یہ کیریکٹر نہیں کروں گا..... مجھے اس دائرے سے نکالو..... مجھے واپس جانے دو..... مجھے واپس جانے دو..... مجھے واپس جانے.....''

کیریکٹر کی ہی جہنمی پل صراط سے بھی گزار سکتی ہے یہ اذیت پسندی اور خود لذتی ہے رعونت بھی کہہ سکتے ہیں لیکن پوری عمر کا روگ تو ہے ہی.....

''کبھی کبھار مجھے کیا ہو جاتا ہے..... یہ..... جو..... میری کمر میں کیسا درد ہے..... یہ میری جان لے کر ہی چھوڑے گا۔ میں نے اشفاق کی بات مان ہی کیوں نہ لی کہ گھڑ سواری کا سین سٹنٹ مین سے کروا لیا جائے۔ ایسا بھی کیا جنون کہ خود ہی سب کچھ کرنے کی قسم کھا لی جائے..... کردار سے انصاف کرنے چلا تھا..... خود سے بھی انصاف نہیں کر پایا اور گھوڑے سے گر گیا..... پتہ نہیں یہ چوٹ کبھی ٹھیک ہو بھی یا نہیں۔''

مصنف نے زمین سے رُلے ہوئے کردار اٹھائے جو اس کا اصل ہے..... اور اس کا باعث ''چاچے دا چھابا'' بنا جہاں راشد کی ملاقات امتیاز علی خاں سے ہوتی ہے..... ناول نگار کو موڑ مڑنے آتے ہیں قاری کو پیچھے لگانا آتا ہے..... میٹومٹی ہونے سے امتیاز علی خاں کی تہذیبی بیٹھک تک کی مسافت ناول کا اثاثہ بنتی ہے.....

ناول کے سبھی کردار۔ ڈر میں لپٹے نفوس لگے۔ راشد، نورین، آصف مراد، زرینہ، نوید، استاد امتیاز علی خاں، طوائف، ہوٹل والا۔

کوئی کتنا بھی دائرے سے باہر نکالنے کی کوشش میں ہو آصف مراد، راشد، نوید، استاد امتیاز علی خاں اور امین گل اکائی بنتے ایک دائرہ بناتے ہیں کسی ماورائی تپسیا میں آتے ہیں۔

دائرہ دائرہ گھومتے بیل ایسی ہے یہ زندگی
اس کنویں کے اُدھر جیسے اور کوئی منظر نہیں

.....

انسان منظر سے باہر یکتا و منفرد ہونا چاہتا ہے مگر چڑھے کھوپے اسے گس کے رکھتے ہیں باگیں کسی اور کے ہاتھوں میں ہی رہتی ہیں وہ اس کا سایہ ہی کیوں نہ ہو...

☆☆☆☆☆

کھوئی ہوئی خوشیاں [ایک تاثر]

رویہ انسان کی پہچان کا ایک زبردست پیمانہ ہے یہی وجہ ہے کہ رویے کسی بھی فرد کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتا ہے اچھے سماج اور تہذیب یافتہ معاشرے کے قیام کے ساتھ ساتھ رویہ سوچ اور کردار کے انداز کی تربیت کرتا ہے رویے ہی سے انسان زندگی اور زندگی کی شائستگی کو سمجھ پاتا ہے رویوں کی تشکیل میں اردگرد کا ماحول، تعلیم، ذہانت، مزاج تجربات اور واقعات کا اہم کردار ہوتا ہے۔

رویے کسی بھی انسان کی شخصیت کا بیان ہے، رویے کسی انسان کو معاشرے اور والدین کی طرف سے دی ہوئی تربیت کی زبان ہے، رویے تو وہ امکان ہے جن کے ذریعے کسی انسان کی مستقبل کا ستارہ نظر آتا ہے۔

بڑھتی ہوئی نفسانفسی، لالچ موقع پرستی اور تعصبات کی وجہ سے حسین رویے مرتے ہوئے دکھائی دیتی ہے" روشن خیالی تو ذہن کی پھپھوندی اتارنے کا نام ہے روشن خیالی دل پہ سے نفرت کی کالک مٹانے کا نام ہے" مگر یہاں کوئی اور معنی مراد لیا گیا ہے رویوں میں روشن خیالی کا فقدان دیکھ کر مستقبل کے بارے میں سوائے مایوس ہونے کے انسان کے دامن میں کوئی امید باقی نہیں رہتی۔

بالامر مجبوری کسی کے خلاف جنگ کرنی ہو تو بندوق کی گولی کے بجائے انسان کا رویہ ایسے نتائج پیدا کرتا ہے جس کے اثرات نسلوں تک قائم رہتے ہیں۔ اگر کوئی مثبت اور تعمیری رویے سے واقف نہ ہو تو پھر رویے سوچوں میں، یادوں میں، دل میں یہاں تک کہ جسم و جاں میں حرکت، جوش، اور ولولہ پیدا کرتے ہیں۔

نوید عائل

یونہی تو نہیں آئی میرے لہجے میں تلخی
رشتوں میں رویوں کا زہر میں نے چکھا ہے

.....

مادیت اور نام نہاد روشن خیالی کے اس دور میں مثبت رویے مرتے ہوئے نظر آتی ہے۔ بچپن میں جب میں پوری طرح بولنا بھی نہیں سیکھا تھا مجھے یاد ہے جب گھر میں سالن یا چاول وغیرہ تیار ہو جاتا تو گھر کی بزرگ خاتون اللہ کے نام پر سب سے پہلے ہمسائیوں کے گھر کچھ حصہ بھیج دیتی اور یہ رویہ عام تھا مگر آج ہمسائیوں کے گھر بچے فاقوں مر رہے ہیں مگر کسی کو کوئی پرواہ ہی نہیں۔

مجھے یاد ہے کہ جب گاؤں میں کسی کا کوئی مہمان آتا تو نہ جانتے ہوئے گاؤں والے پہلے اسے چائے پانی پلاتے پھر مطلوبہ شخص کے پاس لے چلتے۔

راہ چلتے ہوئے اگر کسی کا بچہ غلط کام کرتے ہوئے دکھائی دیتا تو گاؤں یا محلے کے بزرگ اس کو اپنے بچے کی طرح ڈانٹتا اور اس کام سے منع کرتا کمال کی بات تو یہ تھی کہ اس سے بچے کے گھر والے بھی خوش ہوتے مگر آج معاملہ الگ ہے بچے بدمعاش، بزرگ لاپرواہ اور سماج غیر سنجیدہ رویوں سے بھرا پڑا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ معاشرہ خوشی سکون امن کے تجربوں سے گزرنے سے پہلے ہی خوفزدہ اور نادم ہو کر زندگی بسر کرنے لگتا ہے اور خصوصاً نوجوان نسل اپنے اعمال، مزاج اور غیر ذمہ دار رویوں کے حوالے سے بدترین رویوں کا شکار ہیں۔

علاوہ ازیں ہماری مذہبی رویوں میں بھی بڑی تبدیلیاں رونما ہوئی ہے جیسے کہ کچھ عرصہ قبل متحدہ ہندوستان میں ہولی، دیوالی محض ہندوؤں کے تہوار نہیں تھی بل کہ انہیں پورے ہندوستان کے تہوار قرار دیا جاتا تھا، عیدیں صرف مسلمانوں کی نہیں ہندوستان کا تہوار تھیں، کئی سو سال تک ایک ہی ملک میں ہندوؤں، عیسائی، سکھ اور مسلمان سماجی اور ثقافتی تہواروں میں مل کر خوشیاں تقسیم کرتے تھے اور تو اور رمضان کا مہینہ پورے ہندوستان میں مذہبی تہوار کے ساتھ انسانی مہمان نوازی، رواداری اور وسیع دسترخوان کی برکات سے لطف اندوز ہونے کا مہینہ سمجھا جاتا تھا مسلمان افطاریوں میں ہندوں اور سکھوں کو بلایا کرتے تھے جب کہ ہندوؤں اور سکھ دوست مل کر افطاریوں کا اہتمام کیا کرتے تھے معاشرے کا یہ حسین رویہ ایک صدی سے الف لیلوی کہانیوں میں گم ہو کر انجان سا لگنے لگا ہے۔ مگر وقت

نے ایسا پینترا بدلا کے انسان دوستی کا لفظ مٹ کر مسلک مذہب اور طبقوں میں ڈھل کر رہ گیا انسان کا تعارف بگڑ کر اس کے مسلک پیشے اور نسل کے رنگ میں ایسا ڈھلا کہ پھر—

گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

.....

کی تصویر ابھر آئی اور انسان ایسی خوشیوں سے محروم ہوتا گیا جن کی کوئی قیمت تو نہیں تھی مگر ان سے انسان دنیا اور زندگی کا حسن موجود تھا اب اگر انسان کھوئی ہوئی خوشیوں کی ڈھونڈنے کی کوشش کرے تو بات ناممکن سی لگتی ہے کیوں کہ اول تو وہ ان خوشیوں کے تجربے سے نا واقف ہے دوم وہ اپنی تلاش کہاں سے شروع کرے؟ اور کہاں تک جا سکتا ہے ۔

بدلتی ہوئی ظالمانہ رویوں نے انسان کی ثقافتی اور بالخصوص مشرقی سماجی رویوں کو برباد کر کے رکھ دیا۔

تاریخی کتابوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب پاکستان ہندوستان سے الگ ہوا تو جو لوگ کرپٹ، چور اور سود خور تھے تو ان لوگوں سے سماجی فاصلہ رکھا جاتا مگر آج وہ رویہ بلکل بدل چکا ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں پیشہ ورانہ رویے بھی روز بروز مر رہے ہیں ہمارے رویوں میں لچک نہیں ہے ہمارے اندر عدم برداشت کا مادہ اپنے آہنی پنجے گاڑ چکا ہے آپ کسی بھی ادارے میں ہوں آپ کا پیشہ ورانہ رویہ خود آپ کی اپنی ذات کے لیے، آپ کے ماتحت لوگوں کے لیے اور آپ کے سماجی میل جول والے لوگوں کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اگر آپ کا رویہ اپنے ماتحت عملے کے ساتھ ٹھیک نہیں ہے تو یقین مانیے آپ کا عہدہ، آپ کا اختیار دو کوڑی کے رہ جاتا ہے لوگ آپ کو اپنے عہدے کی وجہ سے نہیں آپ کی رویوں کی وجہ سے یاد رکھتے ہیں۔

تہذیب کا آغاز احساس، احترام اور محبت جیسے بنیادی رویوں سے ہوتا ہے اگر انسان ان خصوصیات کا مالک نہیں ہے تو پھر خواہ وہ شاہی محل میں رہتا ہوں یا کسی جھونپڑی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مختصر یہ کہ پہلے ہمیں خود مہذب ہونا ہے اور تہذیب اختیار کئے بغیر ہم کسی تہذیب کے مالک ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے اور مہذب ہونے کا انحصار مال و دولت یا پھر ٹیکنالوجی کا مالک بننے پر نہیں انسان بننے اور انسانی رویے اختیار کرنے پر ہے۔

☆☆☆☆☆

جنونی شاعر کی شاعری

شاعری اپنے وجود میں کئی رنگ، کئی آوازیں، کئی لہجے رکھتی ہے اور انھی کو اپنے چاہنے والوں پر منطبق بھی کراتی رہتی ہے۔ انھی آوازوں، انھی رنگوں، انھی لہجوں میں سے ایک آواز، ایک رنگ اور ایک لہجہ راولپنڈی کے ممتاز قانون دان اور شاعر ''عابد معروف مغل'' کا بھی ہے۔ دنیائے ادب کے اُفق پر جگمگاتا ہوا یہ ستارہ اپنی جگہ آپ اپنی مثال ہے۔ اس کی تابناکی مثلِ نور نہ سہی مثلِ اجالا تو ہے۔ عابد معروف مغل کی شاعری ایک ایسے خود اعتماد شاعر کی شاعری ہے جسے صرف یہ علم ہے کہ اسے شاعری کرنی ہے اور شاعری اسے اس امر پر اسی طرح مجبور کرتی ہے جس طرح کوئی محبوبہ اپنے عاشق کو اپنی انگلیوں پر نچاتی ہے۔ بالکل اسی طرح عابد معروف مغل بھی شاعری کے ساز و آواز سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔

گردش میں یارو جام بڑی دیر تک رہے
وہ مجھ سے ہم کلام بڑی دیر تک رہے

گر خاص ہیں ہم آج تو حیرت نہیں ہمیں
ہم اس جہاں میں عام بڑی دیر تک رہے

عابد ہر ایک نے ہی ہماری مثال دی
ہم عشق کے امام بڑی دیر تک رہے

.....

عابد معروف مغل کی شاعری کے کچھ استعارے مثلاً ''دار'' ''تعزیر'' ''سچ'' ''جھوٹ'' ''سولی'' ''کٹہرا'' ''جرم'' ''رہائی'' زیادہ استعمال ہوئے ہیں جن کی بنیادی وجہ عابد معروف مغل کا قانون دان ہونا ہے۔ اس کے روزمرہ کے مشاہدات میں آنے والے واقعات، کردار، اس کی شاعری میں در آئے ہیں اور یہی اس کی شاعری کی بنیادی اساس ہے جسے ہم اصل نمونہ (Originality) کہہ سکتے ہیں۔ اور یہی وہ خاص وصف ہوتا ہے جو کسی

انجم جاوید

بھی شاعر کو معتبر کرنے میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ آیئے اسی تناظر میں چند اشعار پڑھتے ہیں اور سراہتے ہیں۔

تیرا منصب عدل کی کرسی
میری قسمت ایک کٹہرا

حاکم وقت ہے کٹہرے میں
کھیل قسمت کے سب نرالے ہیں

وقت نے کیسی کروٹ بدلی
باپ تھا منصف بیٹا چور

جرم مجبوریاں کراتی ہیں
کوئی طبعًا بُرا نہیں ہوتا

یہ کٹہرا مرا مقدر ہے
جب تلک فیصلہ نہیں ہوتا

.....

عابد معروف مغل کی شاعری میں ایک اور نمایاں رنگ جو مجھے نظر آیا وہ رشتوں کا احترام ہے اردو شاعری میں ایسا کم کم دیکھنے میں آتا ہے کہ شاعر اپنی شاعری میں ان رشتوں کا ذکر کرکے جو اسے محترم ہیں۔ معتبر کر دے اور اس طرح سے کہ پڑھنے والے بھی اس کے جذبات و احساسات کی گہرائی کو ناپ لیں ، عابد معروف کے انھی رشتوں میں پہلا رنگ ''ماں'' کا ہے - ماں بے شک خالقِ دو جہان کی سب سے بڑی عنایت ، کرم نوازی ہے۔ اس سے سچا، معتبر رشتہ خدائے بزرگ و برتر نے کوئی دوسرا نہیں بنایا۔ عابد معروف نے اس رشتے کو کس طرح سے خراجِ تحسین پیش کیا ہے ملاحظہ کریں:

بلائیں ساری ٹل جاتی ہیں عابد
کوئی ماں جب دُعائیں مانگتی ہے

ماں کی ساتھ دُعائیں ہیں
اپنی یہی کمائی ہے

ماں کی دُعائیں لے کر گھر سے جو نکلیں
ایسے لوگ تو قسمت والے ہوتے ہیں

سروں پہ اپنے بچوں کے ردائیں چھوڑ جاتی ہیں
کہ مائیں مر بھی جائیں تو دُعائیں چھوڑ جاتی ہیں

ماں کی دعائیں لے کر گھر سے جو نکلیں
ایسے لوگ تو قسمت والے ہوتے ہیں

.....

اسی طرح سے ایک نظم ''اے ماں'' کے یہ مصرعے ملاحظہ کریں:

آج جو پورے قد سے کھڑا ہوں
مجھ کو اے ماں
تیری دعا ہے

.....

عابد معروف مغل کی شاعری میں ''ماں'' کے بعد دوسرے جس رشتے کا ذکر بڑی محبت

سے ملتا ہے وہ ان کی اہلیہ کا ہے اس بارے میں عابد معروف لکھتے ہیں کہ" میں اپنی شریکِ حیات کے ادبی ذوق کا ممنون ہوں جو خود بھی کبھی کبھی شعر کہتی ہیں سچ تو یہ کہ یہ کچی پکی شاعری تخلیقات کا جیسا بھی سرمایہ ہے یہ سب اس کی تحریک اور اصرار کی وجہ سے ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ اگر کسی شاعر و ادیب کی بیگم بھی شعری ذوق رکھتی ہو تو بات بنی رہتی ہے ورنہ بدمزگی رہتی ہے" یہ بدمزگی والی بات تو عابد معروف مغل نے بڑے پتے کی کہی ہے بڑے بڑے شاعر بیگموں کے غیر شائستہ مزاج رویوں کو برداشت کرتے کرتے بیگموں سے پہلے مر گئے اور ان کی کتابیں، مسودے، ردی فروش تک پہنچ گئے--- عابد معروف مغل خوش قسمت ہیں کہ ان کی اہلیہ ادبی ذوق رکھنے کے ساتھ ساتھ شعر بھی کہتی ہیں عابد معروف مغل نے اپنی شاعری میں اپنی شریکِ حیات کو یوں محبت کے پھول پیش کیے ہیں۔

ہر گھڑی زیست کے جذبوں کو جواں رکھتا ہے
وہ مرے پیار کو بوڑھا نہیں ہونے دیتا

....

بجز اس کے جہاں میں تیرگی ہے
محبت روشنی ہی روشنی ہے

....

اس شعری مجموعے "اس شہرِ بے اماں میں" صفحہ نمبر 80- اور 152 پر شامل ایک ہی غزل مکمل طور پر- "نذرِ اہلیہ" لگتی ہے-

لفظ گونگے ہیں گر زباں نہ ملے
میرے الفاظ کی زباں تُو ہے

درد کے دشت کا مسافر میں
دھوپ جیون ہے سائباں تُو ہے

سب دیے ٹمٹما گئے پھر بھی
دل کی بستی میں ضوفشاں تو ہے

قریہء ذات میں اکیلے ہم
انجمن تُو ہے کارواں تُو ہے

....

عابد معروف مغل کی شاعری پڑھتے پڑھتے ایک جگہ لفظ "عین شین قاف" پر میں رُک گیا کافی غور کرتا رہا کہ اس سے کیا مطلب لیا جا سکتا ہے؟ لوحِ قرآنی کی طرح سمجھ سے بالا لفظ، بالآخر شاعر سے رابطہ کیا گیا تو شاعر نے بتایا کہ اسے ملا کر پڑھیں عشق ہے پہلے تو وہ قطعہ اور شعر ملاحظہ کریں جہاں یہ عمل دھرایا گیا:

اپنی آنکھوں میں بھر لو پیار عابد
دل کو اب عین شین قاف کرو

قطعہ- ملاحظہ ہو:

اِک وجہِ اعتراف ہے قاتل کی آنکھ میں
یہ کیسا انکشاف ہے قاتل کی آنکھ میں

قاتل کی آنکھ میں لکھا ہے قتل کا سبب
عین شین قاف ہے قاتل کی آنکھ میں

.....

شاعر کی وضاحت اپنی جگہ لیکن قطعہ کے آخری دو مصرعے پڑھ کر میں جس نتیجہ پر پہنچا تھا وہ یہ تھا کہ شاید شاعر اپنا مافی الضمیر واضح نہیں کر سکا اور یہ کہنا چاہتا ہے کہ مقتول کی آنکھ میں قاتل کی شبیہ رہ گئی ہے۔ (میں نے ع ش ق سے عینی شاہد قتل تخلیق کیا) اس کے پسِ منظر میں ایک فلسفہ بھی ہے اور سائنسی نظریہ بھی۔ کہا جاتا ہے کہ جس شخص کو قتل کیا جائے اس کی آنکھ کی پتلی میں ایک مخصوص وقت تک قاتل کی شبیہ رہتی ہے۔ جسے حاصل کیا جا سکتا ہے۔۔ اسی طرح جس طرح یہ کہاوت مشہور ہے کہ ناگ کو قتل کر دیا گیا ناگن نے اس کی آنکھ میں قاتل کا عکس دیکھ کر اس کے قاتل کی تلاش کی اور بالآخر ڈس کر اسے مار دیا۔۔ عابد معروف مغل کی وضاحت اپنی جگہ لیکن یہ قطعہ اور یہ عمل اس کی شاعری کا سب سے کمزور پہلو ہے۔

عابد معروف مغل ایک سنجیدہ سوچ رکھنے والے شاعر کی حیثیت سے ادبی دنیا میں اپنا مقام بنانے کا اہل ہے چونکہ اس نے اپنی سوچ۔ فکر تخلیقی اپروچ سے بہترین شعری لوازمہ پیش کیا ہے یہ اشعار اس کے نمائندہ اشعار کے زمرے میں شامل کیے جانے کے اہل ہیں:

اُس ایک چال باز کی چالاکیاں عجب
بیچا ہے اُس نے آئینہ اندھوں کے ہاتھ میں

.....

تم میں ہے مسیحائی کا یارا تو بتاؤ
میں خاک میں لیٹا ہوں اٹھا کیوں نہیں دیتے

.....

مجھے اس قید سے نفرت ہے یارو
میں پنچھی کو رہائی دے رہا ہوں

.....

میرے پاؤں میں جتنے چھالے ہیں
کس قدر معتبر حوالے ہیں

.....

عابد معروف مغل نے چند نظمیں بھی اپنے مجموعے میں شامل کی ہیں مجھے ان میں ''اے ماں'' ''نا اُمیدی'' ''بے بسی'' پسند آئیں تاہم عابد معروف مغل بنیادی طور پر غزل کے شہسوار ہیں اور یہی ان کا اصل میدان ہے اور اس میدان میں انہوں نے اپنے اسلوب فکر کے ساتھ جو رنگ بکھیرے، جو تخلیقات پیش کیں وہ ایک جنونی شاعر کے شاعری سے محبت کے سچے پھول ہیں۔ یہ بات کم نہیں کہ۔ شعری مجموعے۔ ''اس شہر بے اماں میں'' قاری کو شعر ملتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

''کہانی چل رہی ہے'' شہزاد نیّر

کہانی چل رہی ہے، زندگانی چل رہی ہے
رکے لفظوں میں قرنوں کی روانی چل رہی ہے

.....

اس شعر کے پہلے چار الفاظ تو متذکرہ کتاب کا عنوان بناتے ہیں جبکہ شعر کے بقیہ حصے میں کتاب کی روح کا خاکہ کھینچنے کی کاوش کی گئی ہے۔ ویسے کتاب کے عنوان کا لوک پنجابی متبادل ذہن میں کچھ اور ہی تصویر اجاگر کرتا ہے اور اسی باعث عنوان کی معنوی گہرائی اور وقعت کچھ مزید بڑھ جاتی ہے۔

شہزاد نیر جی ان احباب میں شامل ہیں جن کے ساتھ قلمی و قلبی تعارف کو زمانی اکائیوں کے تناظر میں دیکھنا ممکن بھی نہیں اور مناسب بھی نہیں۔ ان کا بنیادی تعارف تو جدید شاعری میں ایک قدآور نام کے طور پر ہے ہی لیکن اگر آپ ان سے قدرے تفصیلی ملاقات کریں تو آپ پر ہمہ جہتی کے حقیقی اور پورے معانی کھل کر سامنے آئیں گے۔ ان سے اولین ترین ملاقات میں ہی ایک فخر آمیز اندازہ ہوا کہ بہت ہی صاحبِ علم و ہنر ہستی سے دوستی ہونے لگی ہے۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ شہزاد نیر کی ہشت پہلو شخصیت کے پراسرار در مزید کھلتے چلے گئے۔ کچھ برسوں سے یہ جدید فکشن نگاری پر سنجیدگی سے کام کرنے کے تخلیقی جرم میں ملوث پائے گئے تو کوئی خاص تعجب تو نہ ہوا لیکن ایک تجسس سا ضرور پروان چڑھنے لگا۔

مختصر تر افسانہ نگاری جس کے لیے تین چار اصطلاحات رائج ہیں جیسے پوسٹ کارڈ فکشن، فلیش فکشن اور مائیکرو فکشن۔ مائیکرو فکشن اپنی مختصر تاریخ میں غالباً مقبول ترین اصطلاح اور صنفِ مختصر نگاری کی معروف ترین شکل ہے۔ اس صنفِ افسانہ نگاری میں چند سو الفاظ میں باقاعدہ افسانہ لکھا جاتا ہے۔ فکشن نگاری کی اس شکل میں الفاظ کی تعداد کی پابندی ہی مصنف کا امتحان اور قاری کی دلچسپی کا سامان بہم کرتی ہے۔ اگر قلم و قرطاس شہزاد نیر جیسے مشاق لکھاری کے ہاتھ لگ جائے تو بلا مبالغہ شہ پارے اور یادگار تحریریں اردو ادب کے دامن میں جمع ہو سکتی ہیں۔ میری رائے میں مائیکرو فکشن کی ضخامت کو مزید کم کرنے سے شاید اتنی دلچسپی کا سامان نہ پیدا ہوگا۔ ہاں استثنائی صورتیں تو ہمیشہ رہتی ہیں، جیسے کچھ عرصہ قبل مبشر زیدی صاحب نے ''سو لفظوں کی کہانی'' باقاعدہ متعارف کرادی ہے لیکن میں پھر یہی کہوں گا کہ اتنے چھوٹے کینوس پر افسانہ نگاری کے ناگزیر اجزا یعنی تحیر، تجسس، کنفلکٹ یا نفسیاتی کشمکش اور ڈرامائیت کو سمونا

افتخار الحق

کارِ محال ہے۔ میں نے جب اس صنف کا مطالعہ شروع کیا تو انگریزی میں دو مختصر ترین اور شاید عالمی سطح پر معروف دہشت ناک یا خوفناک یا ہارر کہانیوں نے مسحور کر لیا تھا:

پہلی کہانی: The last man on the earth was sitting in a room and the door was locked

اردو ترجمہ یوں ہوگا: زمین پر موجود آخری انسان ایک کمرے میں بیٹھا تھا اور کمرے کا دروازہ مقفل تھا

دوسری کہانی جو پہلی سے زیادہ خوفناک منظر پیش کرتی ہے:

The last man on the earth was sitting in a room and the door was knocked

یعنی: زمین پر موجود آخری انسان ایک کمرے میں بیٹھا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی

کرونا کے آسیبی دور سے کچھ سال پہلے فیس بک پر انہماک نامی فورم پر سید تحسین گیلانی نے مائیکرو فکشن کو مائیکروف کا نام دیتے ہوئے کئی قلمکاروں سے بہت معیاری مائیکرو فکشن لکھوائے اور انھی دنوں شہزاد صاحب کی لکھی کچھ کہانیوں نے خاصا چونکا دیا لیکن ساتھ ہی یہ آفاقی اصول یاد آ گیا کہ اچھا نثر نگار لازم نہیں کہ اچھا شاعر بھی ہو لیکن کسی بھی اعلیٰ درجے کے شاعر میں ایک معیاری قلمکار فعال یا حالتِ تنویم میں رہتا ہے جو کسی بھی لمحہ بیدار ہو کر معاصر نثر نگاروں کو چیلنج کرنے اور اپنا آپ منوانے کی مکمل صلاحیت و اہلیت رکھتا ہے۔ سو شہزاد نیر کے ہاں بھی کچھ یہی معاملہ دکھائی دیا۔ عسکری پس منظر رکھنے کے سبب انھوں نے اسپ قلم کو فکشن نگاری کی طرف موڑا تو کوئی ڈیڑھ سو کے قریب مائیکرو فکشن کے فرسنگ طے کر ڈالے۔ گویا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مائیکرو فکشن ان کے میکرو مائنڈ macro mind کے سامنے واقعی مائیکرو ثابت ہوا۔ اسی پس منظر نے انھیں پاکستان کے کئی دور دراز علاقوں اور مقامی ثقافتوں سے آشنائی کا وسیلہ دیا جسے انھوں نے زبردست قوتِ مشاہدہ و متخیلہ کا عمل انگیز استعمال کرتے ہوئے متنوع موضوعات پر کہانیوں کے قالب میں ڈھالنے کا عمل سکھایا۔ اس پر مستزاد یہ کہ بلا لحاظ عمر انھوں نے آموزش کا عمل ترک نہیں کیا اور یوں ان سارے عناصر کی قبولیت کی کسی خاص گھڑی میں آمیزش نے ایک طرف شہزاد نیر کو تحریک دی کہ مسحور کن غزلیں اور نظمیں لکھیں تو دوسری طرف انھیں پیہم اکسایا کہ فکشن نگاری کی نسبتاً پتھریلی زمین کو اپنے سدا بہار افسانوں سے سرسبز و زرخیز کر ڈالیں۔ شہزاد نیر کے نثری اسلوب کا بہت نمایاں پہلو یہ ہے کہ الفاظ و تراکیب ان کے تخیل کے اسلحے کے سامنے سہمے کھڑے رہتے ہیں اور ان کی نشست و برخاست اسی اسلحے کے زور پر طے پاتی ہے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ انسان کی مصروفیات اور کہانی کے حجم میں تناسبِ معکوس صدیوں پر محیط ایک پیہم ارتقائی عمل ہے۔ داستان سے ناول، ناول سے افسانہ، افسانے سے افسانچے اور پھر مختصر افسانے کے پڑاؤ سے گزرتی ہوئی یہ صنفِ نثر آج نہایت مختصر ہو کر مائیکرو فکشن کی صورت میں ادب کے قاری کے سامنے خواجہ شیکسپیئر کی ساڑھے چار صدی پہلے کی گئی پیشگوئی کو پورا کر رہی ہے:

Brevity is the soul of wit یعنی اختصار ہی اختراع و اظہار کی روح ہے۔ اختصاری اظہار میرے نزدیک نثر میں سہلِ ممتنع کا درجہ رکھتا ہے اور کسی بھی پائے کے شاعر کے لیے یہ صنف یوں آسان ہو جاتی ہے کہ اسے طویل سے طویل مضمون کو دو مصرعوں میں بیان کرنے کی عادت اور سہولت حاصل ہوتی ہے۔ شہزاد نیر کے پہلے مجموعے میں متن اور ورائے متن مشاہدے کی گہرائی، احساس کی شدت و نزاکت، جبر و استحصال کے خلاف زبردست مزاحمت، مذہبی اور سماجی سطح پر دیکھی جانے والی منافقت اور عدم برداشت کا استہزا اور کچھ ایسے موضوعات کی طرف قاری کو متوجہ کرنے کی کامیاب کوشش دکھائی دیتی ہے جو چند عشرے قبل ممنوعہ موضوعات یا tabod کی ذیل میں آتے تھے اور جن پر سعادت حسن منٹو نے اس دور میں بھی خاصے بے باک انداز میں لکھا تھا اور مقبول ہونے کے ساتھ متنازعہ بھی ہوتے چلے گئے۔ شاید اسی مناسبت سے لائلپور نامی محلے میں شہزاد نیر کی چھ کہانیاں ''سیاہ تر حاشیے'' کے عنوان سے کچھ عرصہ قبل شائع ہوئیں۔ ممکن ہے بیشتر احباب اس سے اتفاق نہ کریں لیکن میں اپنے تنقیدی بیانیے لکھتے ہوئے متن اور ماتن دونوں کو اپنے ذہن میں رکھتا ہوں اور ماتن کے دریچے سے مجھے متن کے خدوخال زیادہ کھل کر دکھائی دیتے ہیں اور اس دریچے سے کسی طور بھی تعصب یا جانبداری کی ناخوشگوار ہوا کا گزر نہیں ہوتا۔

''کہانی چل رہی ہے'' کی کم و بیش ہر کہانی میں شہزاد نیر کے قلم کا نشتر ہمارے عمومی سماجی رویوں کے زخموں کو کریدتا ہے تو اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ یہ ناسور بن چکے ہیں۔ ایسے میں یہ نشتر قاری کو ایسا عدسہ دیتا ہے جسے استعمال کرتے ہوئے قاری کم از کم ان ناسوروں کو اس زاویے سے دیکھتا ہے کہ اس کے ذہن میں نہ صرف ان کے ممکنہ علاج کا تصور ابھرتا ہے بلکہ وہ مستقبل میں ایسے مزید ناسوروں کی افزائش کے خلاف حفاظتی تدابیر پر غور بھی کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہر شعبۂ زندگی کا قاری کسی نہ کسی کہانی کے کسی خاص حصے کو پڑھتے ہوئے غیر ارادی طور پر خود احتسابی اور شاید کچھ خود ملامتی کی کیفیت سے گزرنے لگتا ہے۔ میرے خیال میں یہیں مصنف کو اس کی محنت کا اصلی پھل ملنے کی منزل آتی ہے اور اس پر خود اپنی تحریروں کے کچھ پوشیدہ مقاصد آشکار ہونے لگتے ہیں اور اس کے تخلیقی سفر کی رفتار میں عجب سا اسراع آ جاتا ہے۔ شہزاد نیر کی کم و بیش تمام کہانیوں کے اختتامی جملے ہی کہانی کو نقطۂ عروج تک لے جاتے ہیں اور یہی ڈرامائی عنصر مائیکرو فکشن کی جان ہوتا ہے۔ ان میں سے کچھ جملے تو اتنے کاٹ دار ہیں کہ انھیں بار بار پڑھنے اور سنانے کا دل کرتا ہے۔ مثلاً چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

ا: پھر بہن کی تو شادی ہو گئی لیکن لیکن مجھے دنیا کی ہر لڑکی بہن لگنے لگی۔ کسی میں وہ والی کشش ہی محسوس نہیں ہوتی کہانی: نیلی عینک جس میں ایک چھوٹے گھر کے گھٹن آلود ماحول میں ایک عنفوانِ شباب کے نازک دور سے گزرنے والے لڑکے کی ذہنی کشمکش دکھائی گئی ہے۔ یہ لڑکا اپنی بہن اور بھائیوں کے ساتھ ایک چھوٹے سے کمرے میں سونے کی کوشش کے دوران ضبطِ نفس کے عمل کے دوران اپنے اندر پلنے والے مرد کی مردانگی کو قتل کر بیٹھتا

ہے۔ زن گریزی یا misogyny کے ساتھ ساتھ نامردی/ impotence کا تشکیلی عمل سمجھنے کے لیے مجھے یہ بہت اہم کہانی لگی۔

۲: ''پانچ سال بعد ہماری شراکت ختم ہوگئی۔ بس اتنا ہوا کہ میرا سرمایہ اس کے پاس چلا گیا اور اس کا تجربہ میرے پاس آ گیا۔''

کہانی: شراکت کا دھوکہ''۔ یہ کہانی ہمارے گردوپیش میں جگہ جگہ بکھری ہوئی ملے گی۔ شراکت داری کے کاروبار کے شاخسانے

۳: '' تیسرا اشتہار: شیمپو - ناچتی ہوئی لڑکیاں۔ مختلف ہیئر سٹائل۔ ڈرم کی تھاپ پر اچھلتے ہوئے بال، تیز موسیقی۔

میزبان: بریک کے بعد خوش آمدید ناظرین۔ جی مولانا صاحب اگلا سوال لیتے ہیں۔''

کہانی: میڈیا منڈی چیتل

یہ اقتباس ایک بہت دلچسپ کہانی سے لیا گیا ہے جس میں ایک ماڈرن میزبان خاتون کے پروگرام میں ایک عالم دین کو بلایا جاتا ہے جن سے لوگ دین کی حجاب وغیرہ کی تعلیمات پر سوال کرتے ہیں اور عالم صاحب جواب بھی دیتے ہیں اور پروگرام میں وقفوں کے دوران اتفاق سے ایسے اشتہارات دکھائے جاتے ہیں جو عالم دین کے جوابات کی شدید نفی کرتے ہیں۔

۴: ''جب میں نے گزارش کی کہ دعا اس طرح کرو کہ جس کی محنت اور قابلیت زیادہ ہے وہی اول آئے۔ سب حیرت سے میرا منہ تکنے لگے۔ ایک ساتھی نے کہا: ''بھئی جب مقابلہ ہوتا ہے تو دعا صرف اپنے لیے کی جاتی ہے، دوسرے کے لیے نہیں۔'' یہ اقتباس اس کہانی سے لیا گیا ہے جس کا عنوان ہے: ''غیر منصفانہ ذرائع'' اور یہ میرے پسندیدہ ترین مائیکروفس میں سے ہے کیونکہ اس میں ایک ایسا سوال اٹھایا گیا ہے جو اللہ کی رحمت کا موازنہ اللہ کے انصاف کی صفت سے کرتا ہے۔ امریکہ میں کچھ افسروں کا مقابلے کا امتحان ہے اور اس میں کچھ مسلم اور غیر مسلم امیدوار ہیں۔ مسلم امیدوار محنت کے ساتھ مسلسل دعائیں بھی کرتے ہیں اور غیر مسلم یا ملحد افسران ہمہ وقت صرف محنت میں مصروف دکھائے گئے ہیں۔

کہانی کے اختتام تک تحیر و تجسس کی فضا قائم رکھنا ہی فکشن نگار کی کامیابی کی سب سے بڑی دلیل ہوتی ہے اور یہ فضا آپ کو اس کتاب کی ہر کہانی میں ملے گی۔ مجھے تو ایسا اختتام دیکھ کر منیر نیازی کی لکھی سہ مصرعی پنجابی نظم یاد آنے لگتی ہے جس کا آخری مصرع ہی قاری کو پہلے دو مصرعوں اور پوری نظم کا مضمون و مفہوم سمجھاتا ہے۔ مثلاً:

اپنے ای ڈرتوں
نجوے ہوئے نیں
اک دوجے دے نال

نظم کا عنوان: شہر دے مکان

احبابِ گرامی! ادب معاشرے کے ہر شعبے کا عکاس ہوتا ہے بلکہ بقول میتھیو آرنلڈ ادب زندگی پر تنقید کا نام ہے۔ سو ادب کا براہ راست یا بالواسطہ تعلق سیاست، مذہب، معیشت اور سماجی اقدار سے ہوتا ہے - ایک کامیاب فکشن نگار انھی موضوعات کو قدرے مختلف نگاہ سے بغور دیکھتا ہے اور پھر آنکھیں مل کے یہ سوچتے ہوئے دیکھتا ہے:

''تو قریب آ تجھے دیکھ لوں تو وہی ہے یا کوئی اور ہے''۔

پھر وہ اپنے مشاہدات کو اس طرح تشکیل دیتا ہے کہ انھیں قاری تک محض اخباری رپورٹ کی طرح نہ پیش کرے بلکہ وہ اپنی مشاہداتی کیفیات اور

اختراعی صلاحیتوں کے امتزاج سے کچھ مسالے دار چیز پیش کرے جس میں'' صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں'' کا سماں باندھا گیا ہو۔

سو'' کہانی چل رہی ہے'' کے مشمولات ایسے ہی اجزائے ترکیبی و تخلیقی کے پراسرار کیمیائی عمل کے نتیجے میں کہیں ایک اور کہیں ڈیڑھ یا دو صفحوں پر مشتمل چھوٹے چھوٹے افسانچوں کی صورت سامنے آتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ نہایت متنوع موضوعات کی اتنی رنگ برنگی اور اتنی طویل مالاتشکیل دیتے ہوئے کہیں نہ تو یکسانیت کا احساس ہوتا ہے اور نہ کسی کہانی میں تکرار کے عنصر کا ہلکا سا بھی شائبہ ہی ہوتا ہے۔ بس تمام کہانیوں میں بین السطور فلسفۂ جبر و قدر کی کبھی نہ الجھنے والی گتھی اور تشکیک پسندی کی جھلکیاں بہت حساس اور باریک بین قاری دیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ انسان اور اس کے معبود کے رشتے کی پیچیدگیاں اس دور میں چونکہ پیچیدہ تر ہوتی جا رہی ہیں، اس لیے متذکرہ بالا قلمی رویوں کی توجیہ و توضیح بہت حد تک ممکن ہے۔ ''المدعیٰ مع المدلیل'' کے مصداق ایک دو مزید اقتباسات پیش کرنا کافی ہوگا:

۱: ''اس طرح وہ قادرِ مطلق انسانوں کو کم اور زیادہ کرتا رہا اور صدیاں گزرتی رہیں۔'' (کہانی: عہد نامہ موجود)

۲: ''یار تمھارے بغیر مزا نہیں آئے گا تم یہی سمجھو نا کہ عمرے کر کے اس نے پچھلا کھاتہ صاف کرا لیا ہے۔۔ اب نئے سرے سے آغاز کر رہا ہے۔'' (کہانی: دین اور دنیا)

ایسے مختصر افسانوں میں سب سے زیادہ دلکش اور دلچسپ خاصیت یہ ہوتی ہے کہ محض منٹوں میں آپ تین چار افسانے پڑھ چکے ہوتے ہیں۔

پوری کتاب پڑھتے ہوئے جابجا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف نے مکمل دیانت داری کی مائیکروسکوپ سے معاشرے کے قابلِ اصلاح و توجہ پہلوؤں کا تادیر مشاہدہ کیا اور پھر اتنی ہی احتیاط سے ان پہلوؤں کا تجزیہ تخلیقی تجربہ گاہ میں کرنے کے بعد اپنے قارئین کو نباض و معالج گردانتے ہوئے ۴۴۱ مائیکروفی اور ۵ افسانوی رپورتیں کتابی شکل میں پیش کر دی ہیں۔ امید واثق ہے کہ جناب شہزاد نیر کا یہ پہلا مائیکروفی پتھر مختصر اردو افسانہ نگاری کے بظاہر سست رو پانی میں ایسا ارتعاش و تموج پیدا کرے گا جسے جلد ہی عصری ناقدین رجحان سازی گردانے پر مجبور ہوں گے۔

کتاب کے دوسرے حصے میں چھ عدد افسانوں کا تڑکا جدید ترین مختصر تر افسانہ نگاری کے رجحان کو روایتی افسانے کی جڑوں سے پیوند کاری کا عمل لگتا ہے اور یہاں بھی شہزاد نیر کا قلمی بارود خانہ پوری طرح بھرا دکھائی دیتا ہے۔ ذاتی طور مجھے'' روحوں کا ملن'' نامی افسانے نے نہ صرف متاثر کیا بلکہ مصنف کی غیر معمولی فسفیانہ فکر نے شدید حیران بھی کیا۔ کس سہولت سے زمان و مکان کی صدیوں پرانی پہیلی کو روح و بدن کے تعلق کی آڑ میں حل کر کے مصنف نے ایک تشنگی آمیز آسودگی یا آسودگی آمیز تشنگی کا ایسا پراسرار ماحول تشکیل دیا ہے کہ قاری از خود بار بار اس موضوع پر غور کرتا اور سر دھنتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ شہزاد نیر نے اپنے اندر چھپے ہوئے تخلیقی جن کو مکمل طور پر قابو کرنے کے لیے جو چلہ کشی شروع کی ہے وہ کامیابی سے ہمکنار ہوگی اور ہمیں بہت سے حیران کن جھٹکوں کے لیے اپنے آپ کو تیار رکھنا پڑے گا۔

☆☆☆☆☆

مشرف مبشر کی کتاب ''سرگزشت فرانٹیئر کالج''

مشرف مبشر سے میری پہلی ملاقات ہوم اکنامکس کالج کی تقریب پذیرائی میں ہوئی۔ ان کی ملنساری اور مشفق شخصیت نے متاثر کیا۔ دوسری ملاقات گندھارا ہندکو بورڈ میں ہوئی جہاں میں نے انہیں اپنی کتاب ''بیتے ہوئے کچھ دن ایسے ہیں'' دی۔ تو کہنے لگیں میں بڑی سخت ممتحن رہی ہوں۔ تمھاری خودنوشت پڑھ کر تنقید کروں تو خفا مت ہونا۔ میں نے کہا جیسے دل چاہے لکھو۔ پھر دو دن بعد ان کا فون آیا۔ ایک سرشاری کے عالم میں ''بیتے ہوئے کچھ دن ایسے ہیں'' پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا بس آج سے تم میری پکی پکی بہن ہو۔ میں کتاب پر تفصیلی تبصرہ لکھوں گی اور اس وعدے کو ایفا انھوں نے ایسے کیا کہ اباسین ادبی ایوارڈ کی تقریب میں جہاں میری خودنوشت کو اباسین ادبی ایوارڈ برائے نثر ملنے والا تھا، انھوں نے آ کر میرے ہاتھ میں دس صفحوں پر لکھا اپنا تبصرہ رکھ دیا۔ پھر رات کو فون آیا، پوچھا تبصرہ کیسا لگا۔ میں نے کہا بہت اچھا اور اس لئے بہت اچھا لگا ہے کہ یوں تو میری خودنوشت پر اتنے تبصرے لکھے گئے ہیں کہ ان کی پوری ایک علاحدہ کتاب بن سکتی ہے مگر تمہارا تبصرہ منفرد اور میرے سچ کا گواہ ہے۔

فرانٹیئر کالج ہم دونوں کی محبت کا مرکز و محور ہے اور وجہ دوستی و مودت بھی۔

مشرف نے اپنی کتاب ''سرگزشت فرانٹیئر کالج'' دی جو ان کی تحقیق و جستجو کا ثمر ہے۔ اس کتاب کو میں نے بہت شوق سے وصول کیا اور محبت سے پڑھا۔ یہ کتاب تو میرے لئے صحیفۂ محبت ہے۔ کتاب ہے کہ نگارخانہ جس کے ہر صفحے پر یادوں کی بارات اترتی ہے اور میں یاد کے ان حسین جزیروں پر جا اترتی ہوں جہاں میں نے اپنی زندگی کے حسین لمحات بتائے ہیں۔ یہ واحد کالج ہے جس کی منظوری قائداعظم نے 1948 میں دی۔ فاطمہ جناح نے عمارت پسند کی۔ عمارت پسند کرنے کے بعد فرمایا: ''میں نے جو بلڈنگ آپ کے لئے پسند کی ہے، وہ اتنی اچھی ہے کہ میں اگر طالبہ ہوتی تو میں اس کالج میں داخلہ لیتی اور یہیں تعلیم حاصل کرتی۔''

فرانٹیئر کالج کے اونچے محرابوں، وسیع دالانوں اور چہار اطراف کھلے کھلے مہکتے سبزہ زار جہاں اس کے ظاہری حسن کے گواہ

نصرت نسیم

ہیں، وہاں اس کالج کی تاریخ زریں اور روشن روایات کی امین ہے۔
یہی وہ کالج ہے جہاں بیگم رعنا لیاقت علی، ناہید سکندر مرزا اور بیشتر گورنر صاحبان رونق افروز ہوتے رہے۔ اس کے علاوہ قدرت اللہ شہاب، عمران خان، زری سرفراز، کلثوم سیف اللہ، بیگم رضیہ عزیز الدین، بیگم نصر من اللہ اور دیگر نامور خواتین کے علاوہ ملکہ نیپال نے کالج کا دورہ کیا۔
مجلس اردو فہمیدہ اختر کی زیر نگرانی بہت فعال رہی اور کالج میں دبستان پشاور کے نامور شعرا داد باشرکت کرتے رہے۔ خود ہمارے دور میں مجلس اردو کی حلف وفاداری میں سال سوم میں مرتضیٰ اختر جعفری اور سال چہارم میں خاطر غزنوی مہمان خصوصی تھے۔
میں نائب صدر اور صدر رہی۔ میرے پاس کافی تصویریں موجود ہیں۔ کاش مشرف مبشر سے اس وقت میرا رابطہ ہوتا۔
زیر تبصرہ کتاب کا بہت خوب صورت سرورق، عمدہ انتساب اور حرف مدعا مشرف مبشر کی ادبی صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے۔
پہلے باب میں کالج کی عمارت کی قدیم و جدید ہیئت اور تاریخ کا تفصیلی ذکر بہت عمدہ ادبی پیرائے میں کیا گیا ہے۔
پیپل کا درخت شجر کہ جلسہ گاہ اس درخت تلے ہم نے بھی ممتاز محل کے لیے نعرے لگائے۔ اس کے ساتھ جو فوارہ ہے، عین اس کے وسط میں کھڑے ہو کر ہم تین دوستوں نے تصویر اتاری تھی۔ واللہ مشرف جی کیا یاد دلایا۔
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

.....

صوبہ سرحد کا وہ اولین کالج، 1948 میں قائم ہونے والی عظیم و قدیم درس گاہ جس نے خواتین کی ترقی اور انہیں آگے لانے میں بہت فعال کردار ادا کیا۔ یہاں اساتذہ کی وہ کہکشاں تھی کہ جنھوں نے تحریک پاکستان کے لیے تن من دھن کی قربانی دی۔ جن میں سرفہرست سردار حیدر جعفر اور مس فہمیدہ اختر کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ فہمیدہ اختر کو سرحد کی اولین افسانہ نگار ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے اور میری خوش بختی کہ ان سے پڑھنے اور دو سال ان کی زیر نگرانی مجلس اردو کی نائب صدر اور پھر صدر رہی۔
اس کتاب کے ہر صفحے پر میری یادیں بکھری ہیں۔ سو بہت دھیرج سے جرعہ جرعہ لطف کشید کیا۔ ایک ورق پڑھا تو یاد کے کئی ورق کھلتے چلے گئے۔
مثلاً سنیعہ مجید کا ذکر پڑھا تو ان کا خوب صورت سراپا اور پڑھانے کا دل نشیں انداز یاد آیا۔ وہ 1971 میں کوہاٹ سی بی کالج کی پرنسپل تھیں اور سال اول کو یعنی ہماری کلاس کو انگریزی بھی پڑھاتی تھیں۔
مشرف مبشر کی یہ کتاب ہے کہ یادوں کا نگار خانہ کہ کیسے کیسے چاند چہرے لگا ہوں میں، دل میں جگمگا اٹھے۔

مس عذرا زیادہ تر ساڑھی زیب تن کرتیں۔ لبوں پر معصوم سی مسکراہٹ والی مس عذرا دوسرے سیکشن کو انگریزی پڑھاتی تھیں۔ مسز خورشید علی جن کا ذکر بہت محبت سے کیا گیا ہے، وہ میرے آپشنل مضمون فارسی کی استاد تھیں، میں نے ان سے ''گلستان سعدی'' پڑھی۔ مس سید بی بی سادگی و خلوص کا پیکر تھیں۔ کئی برس بعد ان سے نوشہرہ کالج میں ملاقات ہوئی اور وہ میری اس تقریب میں بھی مس چوہان کے ساتھ تشریف لائیں جس کی مہمان خصوصی بیگم کلثوم سیف اللہ تھیں۔

ہماری ہاسٹل کی پشتو بولنے والی لڑکیوں کا ایک شریر سا گروپ تھا، جنھوں نے ہسٹری کے ساتھ پشتو لے رکھی تھی۔ وہ مس بھٹینی کی ڈانٹ ڈپٹ کے قصے مزے لے لے کر سنایا کرتیں۔ بخاری سسٹرز اوپر ہاسٹل میں رہائش پذیر تھیں۔ مسز اختر خٹک ہماری دوست صبیحہ خٹک (جو بعد میں کوہاٹ گرلز کالج کی پرنسپل بنیں) کی خالہ تھیں۔

مسز فریدی، مس ثروت کاظمی، مس فرحت کتنے ہی نام اور چہرے کسی فلم کی طرح ذہن کے سکرین پر چلتے رہے۔ درانی سسٹرز کو بھی کون بھول سکتا ہے۔ سکینہ درانی ہماری وارڈن تھیں۔ ان کی شخصیت کے جلال و جمال کے کیا کہنے۔ کبھی تو ایسی مہربان کہ مسکراتے ہوئے چانس پر دستخط کر دیتیں اور کبھی ایسی بے گانگی اور غصہ کہ کوچی بازار تک کا چانس دینے سے انکاری۔ یہ اور بات کہ صداقت اور الماس لوگوں کا گروپ دھڑلے سے چانس لے کر آتا اور وہ فلم بھی دیکھ کر آ جاتیں۔

کتاب میں مشرف مبشر نے جن دو سعودی شہزادیوں کا ذکر کیا ہے، وہ ہمارے ہی سیشن میں تھیں جن کی آمد نے تھرتھلی مچا دی تھی۔ ان میں ایک بہن سانولی اور ایک چھلتی ہوئی رنگت کی تھی۔ بقول ان کے ان کی اتنی مائیں اور اتنے بہن بھائی ہیں کہ خود انہیں بھی نہیں معلوم کہ کتنے ہیں۔ ہاسٹل کے کامن روم میں ان شہزادیوں کی شاہ خرچیاں سب کو حیران کیے رکھتی تھیں۔ زمان کاکا اور مقبلی کاکا مقبول کردار تھے۔ مسز قریشی کے ساتھ بھی کئی خوش گوار یادیں وابستہ ہیں۔

سرگزشت فراشیر کالج کی دو اہم اور قابل فخر پرنسپلز کا ذکر مصنفہ نے بہت عمدگی اور چابک دستی سے کیا ہے۔ مس برکت اعوان اور مس جلیل۔ مس برکت اعوان کے جانے اور مس جلیل کے آنے، یونین کی صدر کی پریس کانفرنس، لڑکیوں کی ہڑتال اور اتنا ہنگامہ ہوا کہ اللہ بخشے حیات محمد خان شیر پاؤ کو جو ہاسٹل اے اور لڑکیوں کی شکایات سنیں۔ (میری خود نوشت بیتے ہوئے کچھ دن ایسے ہیں میں نے تفصیل سے ذکر کیا ہے) اس مشکل مقام سے ہماری پیاری بہن نظر بچا کر گزر گئیں۔ جب کہ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ایک تحقیقی سرگزشت کے ذریعے در اصل تاریخ رقم کی جا رہی ہے تو مشرف اس کی چشم دید گواہ تھیں۔ انہیں

غیر جانبداری سے سچائی بیان کرنی چاہیے تھی۔
خیر ہمیں مس صفیہ چوہان کی کلاس ملی۔ وہ جب سیڑھیاں اتر کر کمرہ جماعت تک آتیں تو رنگ باتیں کریں اور باتوں سے خوشبو آئے کے مصداق رنگ اور خوشبوؤں کے حصار میں ہوتیں۔ کٹے ہوئے بال، نفیس میک اپ، ناخنوں پر سلیقے سے لگی نیل پالش، اکثر و بیشتر ساڑھی پہنتیں اور جب شیلے، کیٹس اور ورڈز ورتھ پڑھاتیں تو کیا ہی لطف آتا۔ شیکسپیئر کا لیڈی میکبتھ پڑھاتے ہوئے لیڈی میکبتھ کا گویا روپ اختیار کرلیتیں۔ اپنے خوب صورت ہاتھوں کو بار بار دھوتیں اور کہتیں کہ اب یہ ہاتھ صاف نہیں ہو سکتے۔ ڈرامے کے سین وہ ایسے پڑھاتیں کہ ہم سحر زدہ سے انہیں دیکھا کرتے۔ دیکھیں کم و بیش نصف صدی بعد بھی مجھے یاد ہے سب ذرا ذرا۔

برسوں بعد جب وہ نوشہرہ کی پرنسپل بن کر آئیں۔ تو مجھے کالج کی تقریبات میں بطور خاص بلواتیں۔ کلثوم سیف اللہ ان کی دوست تھیں۔ انہیں جب نوشہرہ کلب میں دعوت دی تو مجھے بھی مدعو کیا۔ وہاں مس برکت اعوان بھی موجود تھیں۔ مس صفیہ چوہان نے بڑے اچھے الفاظ میں میرا تعارف کروایا۔ مس برکت اعوان نے مجھے اپنے پاس جگہ دی اور بہت خوش ہوئیں کہ میں بطور خاتون کونسلر کے فلاحی کام کر رہی ہوں۔ مس برکت اعوان کی سادہ و پروقار شخصیت اچھی لگی اور ان سے ملنے کی دیرینہ خواہش پوری ہوئی۔ مجھے کلثوم سیف اللہ سے بھی ملوایا گیا۔ بحیثیت خاتون کونسلر انہوں نے بھی سراہا۔ دست کاری سنٹر کی بچیوں کو اسناد دینے کی تقریب میں بیگم کلثوم سیف اللہ سے وقت لے کر دیا۔ تقریب والے دن مس سیدہ بی بی کے ساتھ تقریب میں شرکت کی۔ یہ سب لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ کیسی عظیم اور خوش خلق شخصیات تھیں۔ دوسروں کا خیال رکھنے والی، عزت دینے والی، اپنے شاگردوں کو دیکھ کر فخر اور مسرت کا اظہار کرنے والی۔

بات تو کچھ طوالت اختیار کئے جا رہی ہے مگر میں کیا کروں کہ اس کتاب کے ہر صفحے پر یادوں کا گلستاں ہے کہ جن کی خوشبو رگ و پے میں سرایت کر رہی ہے۔ مشرف مبشر اچھی افسانہ نگار اور سفرنامہ نگار تو ہیں ہی، اس سرگزشت میں مجھے وہ اچھی خاکہ نگار بھی نظر آئیں۔ انھوں نے بہت عمدگی سے بہت ساری شخصیات کے خاکے لکھے ہیں۔ کالج کی طویل تاریخ، بیشمار پرنسپلز کی ظاہری و باطنی خوبیوں کے بیان کے ساتھ ان کی انتظامی صلاحیتوں کا جائزہ لینا اور لکھنا اتنا آسان نہیں مگر وسیع تعلیمی و تدریسی تجربہ رکھنے والی مشرف مبشر نے اسے بہت عمدگی سے نبھایا۔ کچھ اہم شخصیات کے انٹرویوز اپنی جگہ خاصے کی چیز ہیں۔ ان تمام شخصیات میں انہوں نے مس فہمیدہ رؤف اور مسز سردار حیدر جعفر کے خاکوں میں محبت کے وہ رنگ بھرے ہیں کہ انہیں امر کر دیا ہے۔ ان خاکوں میں قلم کی روانی، بیان کی جولانی، اسلوب کی دلکشی قابل

تحسین وتوصیف ہے۔

مس فہمیدہ رؤف اور مسز جعفر کے ساتھ کراچی کا دس روز دورہ اور ان کی نوک جھوک یاد آ گئی۔

مسز خورشید علی نے علی گڑھ کی طرز پر 1952 میں مجلس اردو کی بنیاد رکھی۔ مجھے فخر ہے کہ مجھے تاریخی مجلس اردو کی نائب صدر اور صدر ہونے کا اعزاز ملا اور مس فہمیدہ رؤف جیسی مجاہدہ اور بلند قامت شخصیت کی محبت وشفقت ملی۔

مس رؤف 18 سال اس کی نگراں رہیں۔ انہوں نے کتنے ہی جواہر تراشے اور ان کی مردم شناس نگاہوں نے کتنے ہی جوہر قابل دریافت کیے۔ مشرف نے کالج کی نمایاں طالبات کا بھی ذکر کیا ہے مگر مجھے افسوس ہے کہ وہ ہمارے 74-1973 کے سیشن کو بھول گئیں۔

73ء میں ہم لوگ 70 روپے میں دس دن کے لئے کراچی گئے تھے۔ کنڈ کی وہ یادگار پکنک جب شہد کی مکھیوں کے حملے کے بعد کالج پہنچے اور کافی لڑکیوں کو ہسپتال داخل کروانا پڑا۔ سرگزشت کے آخری باب میں مصنفہ نے مسز خورشید علی کی ہونہار بیٹی ڈاکٹر سہیلہ کا ذکر بھی بہت محبت سے کیا ہے جو اس وقت امریکہ میں ہارٹ سپیشلسٹ ہیں۔ ان کے دل میں فرانٹیئر کالج سمایا ہوا ہے۔ محبت اور عشق کی بھی کیا بات ہے۔ مشرف نے محبت کی روشنائی سے اس سرگزشت کو لکھا تو مسز خورشید علی کی ہونہار بیٹی ڈاکٹر سہیلہ نے اس کی شان دار پذیرائی کی۔ کالج سے ڈاکٹر سہیلہ کی محبت کو سلام۔ یہ درسگاہ ہم سب کا عشق ہے۔

کتاب کے آخر میں ڈاکٹر سہیلہ کی یاداشتیں اور اپنی ماں کے بارے میں تحریر بھی دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ تو ساتھ ہی شہاب علی فرزند مشرف مبشر کا اپنی ماں کے لیے اظہار محبت وعقیدت بھی اچھا لگا۔

کتاب کا فلیپ مشہور شاعر، ادیب، معلم اور نامور محقق نثار ترابی صاحب کا ہے۔ جن کے سحر طراز قلم نے نہایت عمدہ تحسین وتوصیف کی ہے۔ ان کے دلربا تبصرے سے ایک مختصر اقتباس:

''مشرف مبشر صاحبہ کا شمار ان معدودے چند صاحبانِ توفیق اہل قلم میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنا سارا جیون وطن دوستی، ادب نوازی اور علم پروری کی جستجو اور نمو میں بسر کیا ہے۔ ماضی کی ان مشترکہ یادوں کو تخلیقی وصف سے مالا مال مشرف مبشر نے جس طرح قلب وروح کی والہانہ بے تابیوں اور سرشاریوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس پر وہ دلی مبارکباد کی مستحق ہیں۔''

محترم نثار ترابی صاحب کے اس دلنواز تبصرے کے ساتھ ہی میں بھی اختتامی چند جملوں میں اس طویل تبصرے کو بند کرتی ہوں۔

تحقیق ایک خشک موضوع ہے مگر قلم پر گرفت اور اسلوب کی دل کشی نے اسے ایک دل ربا دستاویز میں ڈھال دیا ہے۔ مشرف نے ایک روشن اور زریں دور کو محفوظ کر دیا ہے۔ اللہ ان کی اس کاوش کو قبول فرمائے۔

آ کہ وابستہ ہیں اس حسن کی یادیں تجھ سے
جس نے اس دل کو پری خانہ بنا رکھا ہے

☆☆☆☆☆

محمد جمیل عباسی کی ''جنتِ ارضی ___ ایبٹ آباد''

مملکتِ خداداد پاکستان کے شمالی علاقہ جات کو قدرت نے بے پناہ فیاضیوں سے نوازا ہے۔ چہار سُو پھیلے ہوئے اِس حُسن کا دروازہ شہرِ سبزہ وگل ایبٹ آباد کو کہا جاتا ہے۔ اپنے پہلے ڈپٹی کمشنر میجر جیمز ایبٹ کے نام سے موسوم یہ خوب صورت وادی ہر سیاح کے دامن دل کو کھینچتی ہے۔ جو بھی اس جنتِ ارضی میں قدم رکھتا ہے وہ یہیں کا ہو کے رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر شاعر اس کے حُسن کے قصیدے لکھتے ہیں تو نثار اس پر بہ انداز دگر نثار ہوتے ہیں۔ شہرِ سبزہ وگل پر قبل ازیں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور ہر لکھاری نے اپنے اپنے زاویۂ نظر سے اس کی دل کشی کو آشکارا کیا ہے۔ یہ سلسلہ جاری ہے اور جب تک یہ شہر قائم ہے یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

اس شہرِ بے مثال سے محبت کی تازہ ترین مثال محمد جمیل عباسی کی ''جنتِ ارضی_ ایبٹ آباد'' ہے۔ ہزارہ ابا سین آرٹس کونسل کے سابق سیکرٹری، علم وفن کے دل دادہ جمیل عباسی ایبٹ آباد کے سچے عاشق ہیں۔ اس شہر سے اُن کی محبت اس سے قبل اُن کی یادداشتوں کی کتاب ''یادداشتیں'' سے بھی عیاں ہے، جس میں اُن کے احوال سے زیادہ اِس شہر کے ناموروں کا تذکرہ ہے۔ ''جنتِ ارضی۔ ایبٹ آباد'' ان کے دل دوسری آواز، اُن کے ذوق کی دوسری پرواز ہے۔

اس کتاب میں انھوں نے ایبٹ آباد کی سیاسی وسماجی، مذہبی و سیاسی، علمی و ادبی اور ثقافتی زندگی کے نقوش کو بڑی خوب صورتی سے اُجاگر کیا ہے۔ یہ ایک طرف ایبٹ آباد کی اہم شخصیات کے کارہائے نمایاں کو نوجوان نسل کے سامنے پیش کرتی ہے تو دوسری طرف یہاں کے دیہاتوں، قصبوں، علمی و ادبی تنظیموں، سیاحتی مقامات، تعلیمی اداروں اور مذہبی و ثقافتی ماحول کو اُجاگر کرتی ہے۔ اس کتاب میں بالخصوص ایبٹ آباد کی سیاسی و سماجی اور ثقافتی زندگی کی بھرپور عکاسی کی گئی۔ جمیل عباسی ہزارہ کے اہم سماجی وثقافتی مرکز ہزارہ ابا سین آرٹس کونسل کے ساتھ تقریباً سترہ سال تک وابستہ رہے ہیں۔ دسمبر 1982 میں اس کے قیام سے ہی جمیل عباسی بطور سیکرٹری اس اہم علمی وادبی اور ثقافتی فورم سے وابستہ ہو گئے تھے۔ انھوں نے اس عہدے پر بڑے خلوص ذمے داری کے ساتھ کام کیا اور ہزارہ کی ثقافت کو ملک بھر میں

قمر زمان

متعارف کرایا۔ ہزارہ اباسین آرٹس کونسل سے وابستگی کے دوران انھیں یہاں کے اہلِ سیاست اور اہلِ علم وفن کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اسی طرح ہزارہ کی انتظامیہ کے اہم عہدیداروں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ انھی شخصیات میں سے ایک اہم شخصیت ہزارہ کے سابق کمشنر اور وفاقی سیکرٹری ریٹائرڈ اعجاز رحیم بھی ہیں۔ جو بلحاظ عہدہ (کمشنر) ہزارہ اباسین آرٹس کونسل کے صدر بھی رہے۔ آپ بذات خود ایک علمی و ادبی شخصیت ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ہزارہ کا اہم علمی و ادبی اور ثقافتی مرکز ''جلال بابا آڈیٹوریم'' انھی کی سعی کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جمیل عباسی اُن کا ذکر بڑے احترام سے کرتے ہیں۔ اس کتاب کا انتساب بھی جناب اعجاز رحیم کے نام ہے۔ اس کے علاوہ کتاب میں جن اکابرین و مشاہیر کا تذکرہ ہے اُن میں شہزادہ بخارا عبدالمالک، سلطان میر، میر ولی اللہ، جلال بابا، حفیظ اثر، سلطان سکون، سعید ناز، میاں نورالدین قریشی، محمد اقبال خان، مولانا محمد اسحاق لودھی، انجینئر ڈاکٹر محمد فاروق، ڈاکٹر محمد نصیر خان، ڈاکٹر صابر کلوروی اور حکیم عبدالعزیز چشتی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ ہستیاں بلاشبہ ہزارہ کے علمی و ادبی، سماجی و سیاسی حلقے میں نامور ہوئیں اور ہراول دستے کا کردار ادا کیا۔ علامہ اقبال جیسی ہستی سے ذاتی مراسم رکھنے والے سلطان میر اور میر ولی اللہ جیسی شخصیات نے ہزارہ میں علمی و ادبی روایت کی بنیاد گزاری کا فریضہ انجام دیا۔ ایبٹ آباد کو سکولوں اور کالجوں کا شہر کہا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ جمیل عباسی نے یہاں کے چند تعلیمی اداروں کی تاریخ کو بھی کھنگالا ہے اور ان کی اہمیت کو مکمل پس منظر کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ ان اداروں کی تاریخ، اہم شخصیات کی ان سے وابستگی، ملکی امور میں ان کی کارکردگی جیسے موضوعات کو جمیل عباسی نے بڑی عرق ریزی سے یکجا کیا ہے۔

کتاب کا آغاز اس شہرِ بے مثال کے پہلے رئیس و منتظم میجر جیمز ایبٹ آباد کے ذکر سے ہوتا ہے اور تاریخی حوالوں سے فقید المثال شخصیت کی خدمات کا اعتراف کیا گیا ہے۔ ایبٹ آباد کے حوالے سے جیمز ایبٹ کی نظم کا اُردو ترجمہ بھی شامل کیا گیا ہے: جمیل عباسی کی وسعی المشربی کا ایک اور ثبوت یہ بھی ہے کہ انھوں نے یہاں کی مسیحی برادری کو بھی موضوع بنایا ہے۔ ایبٹ آباد میں مسیحی برادری سب سے بڑی اقلیت ہیں لہٰذا اس شہر کی تعمیر و ترقی میں اُن کی خدمات اور کئی اہم شخصیات کے ساتھ ساتھ بڑی محنت سے اُن کی عبادت گاہوں یعنی کلیساؤں کی تاریخ کے مخفی گوشوں کو بھی عیاں کیا ہے۔ اس سے پہلے بہت کم اس طرف توجہ دی گئی ہے۔ حالانکہ اس شہر کی تعمیر و ترقی، صفائی ستھرائی اور انتظامی امور میں انھوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ کتاب

کو مختلف عنوانات کے آٹھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں تحصیل سے ضلع تک، تحصیل ایبٹ آباد، عروس کوہسار گلیات، تحصیل لوہر تناول، تحصیل بورہ، دعوتِ تبلیغ، جنگلات، ادیب وثقافت دیگر موضوعات کا احاطہ کرنے کے ساتھ ساتھ یہاں دین کی تبلیغ اور آغاز و ارتقا پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ 1985 میں یہاں ہونے والے ایک تبلیغی اجتماع اور بعدازاں 1981 میں موجودہ تبلیغی مرکز کے قیام اور اس کے اثرات کا بھی احاطہ کیا ہے۔

جمیل عباسی کے بس میں ہوتا تو وہ اس شہرِ بے مثال کے چیڑھ و چنار کے درختوں کے قصیدے لکھتے، اس کے پہاڑوں اور میدانوں کی مدح سرائی کرتے اور اس کے چمکتے ذروں پر دفتروں کے دفتر لکھ ڈالتے لیکن اُن کی پیرانہ سالی آڑے آئی اور انھیں بادلِ ناخواستہ ہی اپنا قلم روکنا پڑا، لیکن اس کے باوجود اس شہرِ دل آویز کے نقوش کو اس خوب صورتی سے ابھارا ہے کہ قاری کی آنکھوں کے سامنے کے جلوے بکھیر کے رکھ دیئے ہیں۔ جو اُن کی ایبٹ آباد سے بے پناہ محبت کا ثبوت ہے۔ یہ کتاب بیک وقت تاریخ بھی ہے، آپ بیتی بھی اور جگ بیتی بھی سوانح نگاری کا عمدہ نمونہ بھی ہے اور سماجی و سیاسی اور ثقافتی زندگی کا مرقع بھی ہے جس میں یہاں کے خوب صورت مقامات کی ایسی دل کش تصویر کشی کی گئی ہے کہ ہر قاری کے دامنِ دل کو کھینچی ہے۔ جمیل عباسی کو اپنے شہر، اس کے در و دیوار، اہلِ علم وفن، اسلاف و اکابرین سے جو محبت اُس کے مظاہر کتاب میں جا بہ جا بکھرے نظر آتے ہیں۔

کتاب بڑے دل نشیں اور خوب صورت انداز اور رواں نثر میں لکھی گئی ہے۔ جا بہ جا خوب صورت اشعار کو نگینوں یک طرح جڑ دیا گیا ہے۔ اہلِ علم و دانش کی محبتوں میں نصف صدی سے زائد عرصہ گزارنے والے جمیل عباسی کو زمان و بیان پہ جو دسترس حاصل ہے اس نے کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیا ہے۔ کتاب کے مندرجات کی جمع آوری کے لیے جمیل عباسی نے جو تگ و دو کی ہے وہ قابلِ تحسین ہے یہ کتاب آنے والے محققین کے لیے ایک بنیادی حوالے کی کتاب ہے ایک اہم دستاویز ہے، جو خلوص، محنت و لگن سے مرتب کی گئی ہے۔ جمیل عباسی عمر کی آٹھویں دہائی میں ہیں، اس عمر میں اُن کا یہ کام نوجوانوں کے لیے امید و حوصلے کا ایک پیغام بھی ہے اور اُن کے لیے ایک چیلنج بھی کہ اگر کام کرنے کی لگن سچی ہو۔ اپنے کام سے عشق ہو تو دنیا کا کوئی کام مشکل نہیں ہے۔

کتاب کو کئی سَرورق کی خوب صورت تصویر کے علاوہ کئی اہم مقامات کی تصاویر سے مزین کیا گیا ہے، جو کتاب کے حسن میں اضافے کا باعث ہے۔

☆☆☆☆☆

،،نیند کے شہر میں،،.....امید کے جگنو.....

عہد حاضر کے ادبی منظر نامے پر نگاہ پڑتے ہی بیشمار نام درخشاں ستاروں کی مانند چمکتے دکھائی دیتے ہیں میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ ہر شاعر و شعر کا مقام و مرتبہ اس کے اپنے قارئین متعین کرتے ہیں مثال کے طور پر ممکن ہے کہ زید و بکر کے مطالعہ میں آنے والا کوئی شعری فن پارہ ایک جیسی قبولیت حاصل نہ کر پائے کیونکہ زید و بکر کی سوچ کی اپروچ مختلف ہو سکتی ہے دونوں کی فکر کا معیار جداگانہ ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کسی ایک آئیڈیل دوسرے کی نظر میں زیرو ہو۔ اس لیے بڑے شاعر سے بڑا انسان ہونا بہتر ہے معذرت کے ساتھ کہنا چاہوں گا کہ چالیس پچاس سالہ فنی ریاضت کے بعد کچھ شعرا خود کو خدائے سخن سمجھنے لگتے ہیں اور جونیئرز کو اپنی مخلوق۔۔ لیکن چنیدہ ایسے بھی ہیں جو نئے مسافران ادب کو سر کا تاج اور قبر کا چراغ سمجھتے ہیں ایسی ہی باوقار ہستیوں میں ایک نام جناب امین اڈیرائی کا بھی ہے جو گزشتہ چالیس برس سے سندھی، اردو اور پنجابی زبان میں ادب کی آبیاری میں مگن ہیں جناب امین اڈیرائی نے اڈیرو لال اسٹیشن (سندھ) ایک چھوٹے سے قصبے میں رہ کر اپنے فن کا لوہا منوایا ہے۔

سوشل میڈیا میں لاکھ خرابیاں سہی مگر اس نے شعر کے سفر کی رفتار بڑھا دی ہے برسوں کا پہیہ، لمحوں میں گھومنے لگا ہے شعر میں جان

ارشد محمود ارشد

ہو تو ایک جست میں میلوں کا فاصلہ طے کر سکتا ہے جناب امین اڈیرائی کے فن پارے سوشل میڈیا کے دوش پر براعظموں کے سفر پر گامزن دکھائی دیتے ہیں۔

جناب امین اڈیرائی کی درجنوں تصنیفات منظر عام پر آ چکی ہیں مگر جو پذیرائی انہیں سوشل میڈیا کی بدولت حاصل ہوئی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ وہ شعر ہی نہیں کہتے بلکہ نثر کے میدان میں بھی فکر و فن کے گھوڑے دوڑاتے دکھائی دیتے ہیں۔

،، نیند کے شہر میں،، عنوان کے تحت ان کا اردو شاعری کا چھٹا شعری مجموعہ ہے جو کہ غزلوں اور نظموں پر مشتمل ہے جو لوگ جناب امین اڈیرائی کو ذاتی طور پر جانتے ہیں ان پر یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ان شاعری اور زیست دونوں سادہ و پُر وقار ہیں کسی میں بھی بناوٹ جیسا مصنوعی پن دکھائی نہیں دیتا۔ یہی وجہ کہ وہ خود دوستوں اور ان کے اشعار قارئین کی گرفت میں جلد آ جاتے ہیں۔ وہ مشاہدات، تجربات و احساسات کو شعری پیکر عطا کرنے کا ہنر خوب جانتے ہیں۔

سہمی سہمی سی ڈر میں رہتی ہے
لاکھ باتیں جگر میں رہتی ہیں

ایک آواز کے تعاقب میں
میری آنکھیں سفر میں رہتی ہیں

.....

یار سے دکھ ملا تو سوچتا ہوں
پھول کس طرح خار ہو گیا ہے

.....

چھوڑ جاتے ہیں دوستو ! اک دن
سکھ بھی ہوتے ہیں بیٹیوں کی طرح

.....

لائق اعتبار تھا ہی نہیں
وہ جسے ہم نے معتبر جانا

.....

جناب امین اڈیرائی محبت کے پیامبر ہیں محبت کرنے والے نفرتوں میں سے بھی الفت کشید لیتے ہیں محبت کے کئی روپ ہیں محبت کے کئی رنگ--- وطن کی مٹی، ماں کی آغوش، کسی کی آنکھیں، کسی کے خواب، دل میں پنپتا ہوا احساس--- سب محبت ہے:

ہونٹ پیاسے تھے ایک مدت سے
اس نے آنکھوں کے جام رکھ دیئے تھے

اک طرف اس کی مسکراہٹ بس
اک طرف سارے کام رکھ دیئے تھے

.....

ہو مری یا کہ پھر تمہاری ماں
دوستو ! کس قدر ہے پیاری ماں

گھر کی خاطر ہزار کشٹ سہے
پھر بھی ہمت کبھی نہ ہاری ماں

.....

جناب امین اڈیرائی ظلمت شب میں امید کے جگنو کو سہارا سمجھتے ہیں وہ ناامید نہیں ہوتے اور نہ قاری کو ہونے دیتے ہیں اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ رات چاہے کتنی طویل و تاریک ہو سورج کی پہلی کرن اس کا قصہ تمام کر سکتی ہے ہر رات کا انت..... سحر کی نمود کا پتہ دیتا ہے ناامیدی کفر اور امید منزل کے نشاں دکھاتی ہے:

تیرگی کا ہجوم تھا لیکن
ایک جگنو کو مات دے نہ سکا

.....

ظلمت شب کا پہلے ڈر دینا
اور پھر رونق سحر دینا

.....

دشت کربل میں ، صبح ہوتے ہی
شام کے شر سے لوٹ آیا ہوں

.....

جناب امین اڈیرائی کا یہ شعری مجموعہ دلنشیں غزلوں کے ساتھ ساتھ پر لطف و معیاری نظموں پر مشتمل ہے سینۂ قرطاس پر دھڑکتی ہوئی ایک نظم ،،آلودگی،، دیکھئے:

مسلسل پیڑ کٹتے جا رہے ہیں
ہوا میں زہر گھلتا جا رہا ہے

ہمیں اب دھوپ جھلسانے لگی ہے
ہر اک آنگن کا سایہ جا رہا ہے

ضمانت ہیں جو ان سانسوں کی یارو
انہیں ایندھن بنایا جا رہا ہے

زمیں سے چھن رہی ہے سبز چادر
مگر ہر شخص ہنستا جا رہا ہے

نہیں احساس تک کوئی کسی کو
زمیں کا درد بڑھتا جا رہا ہے

.....

اسی طرح ایک خوب صورت نظم ،، کشکول میں پڑی بھوک ،، کرونائی عہد کی عکاسی کرتی دکھائی دیتی ہے آپ اس نظم کو ضرور پڑھئے گا مجھے یقین ہے کہ آپ جناب امین اڈیرائی کے فکر و فن کو داد دیں گے میری بہت سی دعائیں جناب امین اڈیرائی کے لیے۔

☆☆☆☆☆

پنجاب کے گمشدہ کردار/مداری [بھولا باندری]

ایک زمانہ تھا جب بادل بارش اور ڈگڈگی کی آواز پر مرد عورت بوڑھے بچے حتیٰ کہ جھولے میں لیٹے بچے بھی ہمکنے لگتے تھے اور جو چلنے پھرنے کے قابل ہوتے وہ گھر سے نکل کر ڈگ ڈگی کی آواز پر لپکتے اور آخر کسی نہ کسی گلی کی نکڑ پر وہ تماشا دیکھ لیتے جس کی تمنا میں وہ گھر سے نکلے تھے ڈگڈگی کی آواز سنتے ہی مداری کا خیال اور اس خیال سے بندھے ریچھ بندریا بکری اور کتے بھی مجسم ہو جاتے ہیں - مداری ڈگڈگی ، ریچھ، بندریا، بکری اور کتا ایک خاندان ہے، اس میں سے ایک بھی کم ہو تو بات نہیں بنتی پھر اس پورے خاندان کو دیکھنا ہو، تو ڈگڈگی کی آواز پر لگے اس دائرے کو دیکھیں جہاں یہ سب اپنی فطرت اور جبلت سے ہٹ کر روزی روٹی کمانے میں نڈھال ہوئے جاتے ہیں- اور تالیوں کی گونج میں مداری کی آواز سنائی دیتی ہے، شاوا بھئی شاوا چل بھئی چل دیکھ باؤ لوگ جمع ہیں- چل چل اپنے سورے چل، مداری کا اتنا کہنا تھا کے بندریا نے دونوں ہاتھ کمر سے لگائے اور دو ٹانگوں پر کھڑی ہو کر چلنا شروع کر دیا- بندریا کچھ شرمائی پھر، کسی نوجوان لڑکی کی طرح چلتی ہوئی دائرے میں گھومنے لگی، لوگوں نے تالیاں بجا کر داد دی، مداری کا حوصلہ بڑھا اور اس نے بکری کو مخاطب کیا چل بہن تیری باری اے، میری سوہنی بچی پھر رسی کھینچ کر بکری کو قریب لایا اور ایک چارانچ چوڑے لکڑی کے پائے کو آگے کیا اور پھر بکری سے مخاطب ہوا چل بہن چڑھا، نیں تے میں چڑھ جانا اے، فیر نہ کہنا کے ابا کم خراب کروا اے، لوگوں نے قہقہہ لگایا مداری مخالف ہوا، چل میری سوہنی چڑھ جا، مداری کا یہ کہنا تھا کہ بکری چار انچ لکڑی کے پائے پر چاروں پاؤں رکھ کر کھڑی ہو گئی، لوگوں

اعجاز رضوی

نے تالیاں بجا کر داد دی، مداری نے بڑے فخر سے مجمع کو دیکھا اور بولا لے ہن ریچھ تے ڈبودی ذمہ داری اے، مداری کا اتنا کہنا تھا کے ریچھ اور ڈبو کتے نے غرانا شروع کر دیا۔ مداری مخاطب ہوا، نہ بھئی نا ہیجے نئیں۔ میں کہنا اے تے فیر لڑائی کرنی اے، ریچھ اور کتا پھر غرارے" اور آمنے سامنے آ گئے۔ لوگوں نے تالیاں بجا کر خوشی کا اظہار کیا۔ مداری نے آواز لگائی لڑائی ویکھنی اے تے اللہ دے ناں تے کچھ دے کر بیٹھو، لوگوں نے جیب سے پیسے نکال کر دائرے میں پھینکے تو بندریا نے روپیہ پیسہ اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ لوگوں نے تالیاں بجا کر خوشی کا اظہار کیا جب پیسے اکٹھے ہو گئے تو مداری نے ایک بار پھر کتے اور ریچھ کی رسی کھینچی دونوں کو سامنے لایا، اور بولا، لڑائی کرو، پر میرا پتر مارا ماری نہیں کرنی، کتے اور ریچھ نے ایک دوسرے کو گھورا، اور گتھم گتھا ہو گئے۔ لوگوں نے تالیاں بجا کر داد دی، کوئی ریچھ کی طرف سے داد دے رہا تھا کوئی کتے کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا، مگر مداری کی طرف کسی کا دھیان نہیں تھا، کچھ دیر یہ لڑائی چلی لوگوں نے پھر پیسے دیئے، تو مداری نے بآواز بلند دعائیں دی، اور مجمع چھٹ گیا مگر چند بچے بیٹھے رہے مداری نے انھیں مخاطب کیا چل پتر چل خیر نال گھر جا تے ماں نوں شکل وکھا۔

..... ماں وچاری لبھدی ہووے گی .....

تے مینوں سنے ٹبر دے گالاں کڈی دی ہووے گی، پھر ہر کام سے فارغ ہو کر بھولا باندری نے ادھر ادھر دیکھا پھر آسمان کی طرف منہ کیا اور مخاطب ہوا، ربا تیرا شکر کے عزت رہ گئی، جے ریچھ کتا باندری تے بکری اپنی آئی تے آ جاندے تے فیر فاقہ ہی ہونا سی ربا تیرا شکر اے۔ بھولا باندری قد کاٹھ کے لحاظ سے کسی فورس کا رکن لگتا ہے، رنگ ایسا کے بغیر میک اپ کے افریقی لگتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ دھوپ میں پھر پھر کر اس کا رنگ ایسا ہو گیا ہے ورنہ وہ بھی ذرا پکے رنگ کا تھا۔ اس کی چال ڈھال دن میں کئی بار بدلتی ہے۔ کبھی چال ڈھال سے بکری لگتا ہے کبھی ریچھ اور کتا اور کبھی باندری، اس کے ایک ہاتھ میں ڈگڈگی ہوتی ہے اور ایک میں بکری بندریا، ریچھ اور کتے کی رسی۔ کاندھے پر ایک گٹھڑی ہوتی ہے اس میں کیا بندھا ہوا ہے اس بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ یہ عام طور پر لنگی اور سلوکا پہنے پھرتا ہے۔ سردی ہو تو ایک کمبل نما چادر لپٹ لیتا ہے، پاؤں میں ہمیشہ قینچی چپل پہنتا ہے، اسی لیے اس کے پاؤں پر قینچی کا نشان بن گیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ پہلے ہم لوگ فقیر ہوتے تھے۔ مگر جب لوگوں نے بغیر مطلب کے خیرات

دینی چھوڑ دی تو ہم نے بھی یہ پیشہ چھوڑ دیا۔ پھر ہم زمین داروں کے شوق پورے کرنے لگے۔ پھر ذرا بھروسے مند ہوئے تو زمین داروں کے کتے اور ریچھ کو دنگل کے لیے تیار کرنے لگے ویسے تو صاحب جی، کتا اور ریچھ ہمارے سامنے ہوتے ہیں، مگر دراصل تو ہم ہی وہ کتے اور ریچھ ہیں جن پہ زمین دار کی نظر ہوتی ہے صاحب جی، کتا ہو یا ریچھ باندری ہو یا بکری زمین دار کے قابو میں نہیں آتے اس نے ہمیں قابو کیا ہوا ہے۔ ویسے ہم باندری ریچھ کو قابو کرتے نظر آتے ہیں مگر دراصل ہم مادہ ریچھ اور باندری کو ہی پالتے ہیں اور ان کو سکھاتے ہیں، صاب جی، 3 سے 4 ماہ میں باندری سیکھ جاتی ہے مگر مادہ ریچھ تو اپنی بڈھی کی طرح تنگ کرتی ہے کچھ سیکھ کر نہیں دیتی صاب جی پہلے وقتوں میں ہمارے بزرگ مری، نتھیا گلی، سوات اور ڈیرہ اسماعیل کے جنگل سے پکڑی ہوئی باندری چار سے آٹھ ہزار میں خریدتے تھے۔

باندری پکڑنے کا طریقہ بھی صاب جی، بڑا عجیب ہے۔ شکاری، تنگ منہ والے گھڑے میں چنے رکھ دیتا ہے۔ اور باندری یا اس کے بچے اس میں ہاتھ ڈال کر چنے کی مٹھی بھرتے ہیں اور پکڑے جاتے ہیں، یہ چنے پکڑنے کے بعد مٹھی کھولتے نہیں - ویسے صاب جی، جب سے مری، سوات وغیرہ میں وڈے لوگوں نے جانا شروع کیا ہے، وہاں سے سارے باندر کہیں اور چلے گئے ہیں، بھئی اُن کا کہنا ہے جب دو پاؤں والا وڈا باندر آ جائے تو پھر ہماری منہ وکھالی کیسے ہوگی، بس صاب جی، اپنی گزر رہی ہے ہولی ہولی ہم بھی جانوروں کی نسلوں کی طرح نایاب ہو جائیں گے ویسے بندے کے پتر تو ویسے ہی نایاب ہو گئے ہیں صاحب جی شہر میں آ کے پتہ چلا، جیتے رہنے کے لیے کافی کچھ ضروری ہے مگر ہم نے تو اپنا رزق جانوروں سے باندھ لیا ہے۔ وہ پھل کھائیں تو ہم بھی پھل کھائیں، وہ مار کھائیں تو ہم بھی مار کھائیں، چلیں صاب جی، جو سوہنے رب کو منظور یہ کہہ کر بھولا باندری۔ گٹھڑی کاندھے سے لٹکاتا ہے کتے، ریچھ، بندریا اور بکری کی رسی کو ہاتھ پر بل دے کر سختی سے پکڑتا ہے، اور ڈگڈگی بجا کر کسی اگلی گلی میں جانے کی تیاری کرتا ہے۔ مگر اس بار اس کا قدم جس گلی میں پڑے گا، وہ گلی بند ہوگی

بھولا باندری کہیں نظر نہیں آئے گا۔ بس ڈگڈگی کی آواز سنائی دے گی اور اس آواز پر ہم سب ناچ رہے ہوں گے کے ریچھ، کتا، بکری اور باندری کے ساتھ اب مداری بھی نایاب ہوگا۔

☆☆☆☆☆

غزل

برے دنوں کے دکھی ساعتوں کے ساتھی ہیں
یہ لوگ بھی مرے غارت گروں کے ساتھی ہیں!

یہ لوگ مول چکائیں گے میرے بعد ترا
یہ خانہ زاد، مرے بھائیوں کے ساتھی ہیں

میں ایک رو میں رواں قریۂ غبار میں ہوں
یہ گرد زاد مری وحشتوں کے ساتھی ہیں!

پلٹ نہ جائیں ترے ہجر کے جہنم سے
یہ راستے کہ مری ہجرتوں کے ساتھی ہیں

وفا کے رنگ دکھوں کے جلو میں کھلتے ہیں
یہ برف رنگ مری رفعتوں کے ساتھی ہیں

خطِ نگاہ مرے ساتھ ساتھ چلتا ہے
پسِ نگاہ مرے دشمنوں کے ساتھی ہیں

کسی کے پاس، کسی کے لیے یہاں کیا ہے
یہ کورچشم مرے وارثوں کے ساتھی ہیں

دوا کے ساتھ دعا کی طلب نہیں رکھتے
یہ بندگانِ خدا حجتوں کے ساتھی ہیں

فلک ستارہ تہی ، آنکھ نم تہی خالد
یہ دکھ نمو سے تہی بادلوں کے ساتھی ہیں

خالد احمد

غزل

غم کے اوراق سنبھالے نہیں جاتے ہم سے
لفظ لکھتے ہیں جو لکھے نہیں جاتے ہم سے

گو بہت شوق دلایا ہے انھیں مکتب کا
پھر بھی بچّے ہیں کہ بھیجے نہیں جاتے ہم سے

آپ کو بات بتائیں گے محبت کی کہاں
دل کے اسرار تو کھولے نہیں جاتے ہم سے

تم ہمیں بام فلک پر نہ کہیں دیکھو گے
اس بلندی پہ ہلارے نہیں جاتے ہم سے

غم کا معیار تنوع سے ہے مشروط ہوا
اس قدر روگ تو جھیلے نہیں جاتے ہم سے

جانے ہر روز یہ ثاقب ہے سنورنا کیسا
بھیس آنکھوں سے بھی بدلے نہیں جاتے ہم سے

آصف ثاقب

غزل

حسن عسکری کاظمی

آساں نہیں کہ جینے کا ساماں دکھائی دے
مشکل تو ہے یہی کہ یہ آساں دکھائی دے

کشتی کا اب بھنور سے نکلنا محال ہے
موجِ خیالِ یار بھی طوفاں دکھائی دے

ظلمت نصیب شخص کے رخ پر جو کی نگاہ
پلکوں پہ آنسوؤں کا چراغاں دکھائی دے

میں دل گرفتہ شہر میں پھرتا ہوں دربدر
جس پر نظر پڑی وہ پریشاں دکھائی دے

آنکھوں کا نور دل کے اُجالے کہاں گئے
اک مضمحل سی روشنی رقصاں دکھائی دے

پیڑوں سے طائروں نے کیا کوچ خوف سے
گلشن بھی اب تو مجھ کو بیاباں دکھائی دے

آیا وہ خواب میں مجھے کل شب نظر حسن
جیسے وہ کم سخن بھی پشیماں دکھائی دے

غزل

مَنّا مری اتنی کہ سنبھالی نہیں جاتی
پر مجھ سے کوئی راہ نکالی نہیں جاتی

کونپل نئی کیا سوچ کی پھوٹے کوئی، جب تک
مانگی ہوئی دانش کی جگالی نہیں جاتی

اُس ہاتھ کا توڑا ہوا جوڑا نہیں جاتا
اُس لب کی نکالی ہوئی ٹالی نہیں جاتی

اک اوجِ تفاخر سے اُترنا نہیں ہوتا
اک حالتِ اُفتاد بحالی نہیں جاتی

کس گنجِ معانی سے تہی دشتِ غزل ہے
کس گنج تلک ریزہ خیالی نہیں جاتی

لکھوائے چلی جائے ہے کیا کیا سرِ قرطاس
اک دُھن کہ جو الفاظ میں ڈھالی نہیں جاتی

اک مظہرِ اعزاز سمجھتے جو نہ عالی
اِس خبط سے کیا جان چھڑا لی نہیں جاتی

جلیل عالی

غزل

لطفِ کم مائیگی و کم طلبی لیتا ہوں
جتنا آرام سے مل جائے وہی لیتا ہوں

یاس انسان کو دیوانہ بنا دیتی ہے
میں تو ہر پہر سے امید نئی لیتا ہوں

تلخیاں اپنی جگہ، سود و زیاں اپنی جگہ
زندگی تجھ کو بڑے پیار سے جی لیتا ہوں

اس قدر سایۂ اشجار میں جی لگتا ہے
دھوپ بھی ہو تو درختوں سے چھنی لیتا ہوں

میرے پل پل کو مری عمر کا حاصل کر دے
میں تو ہر حرف سے بس کام یہی لیتا ہوں

اتنا کافی ہے اگر ناخنِ تدبیر سے میں
اپنے ہر چاک گریبان کو سی لیتا ہوں

صبر کا اجر مداوا ہے اگر مل جائے
اتنا کیا کم ہے ترے بعد بھی جی لیتا ہوں

اچھا لگتا نہیں ہر روز کا آنا ، جانا
واپسی پر میں کوئی اور گلی لیتا ہوں

عمر کٹتی ہے تو کٹ جائے کنورے کے بغیر
جب میسر ہو بڑے شوق سے پی لیتا ہوں

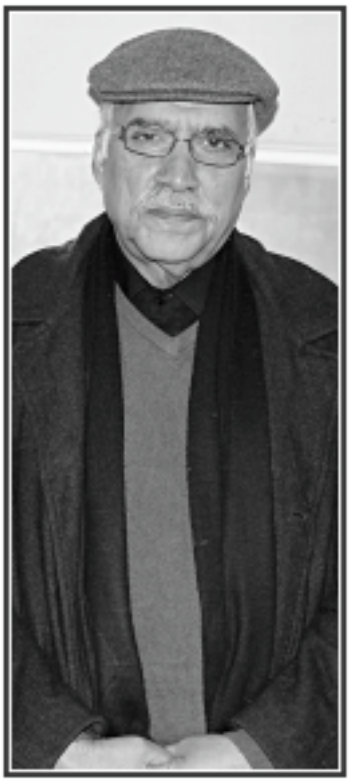

اعجاز کنور راجہ

غزل

ہم اپنی سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں
مگر یہ لوگ کیوں روٹھے ہوئے ہیں

ہمیں طعنے نہ دو چوپال والو !
کہ ہم خود کو ابھی بھولے ہوئے ہیں

کہاں لگتا وگرنہ روگ دل کو
ہمیں لگتا ہے ہم ٹوٹے ہوئے ہیں

کوئی خواہش بظاہر تو نہیں ہے
ہمارے ہاتھ کیوں پھیلے ہوئے ہیں

سنو ! ہم سے ابھی تم کچھ نہ پوچھو
ابھی ہم انت سے الجھے ہوئے ہیں

اجازت ہے تمہیں شب خون مارو
پہ ہم سوئے نہیں جاگے ہوئے ہیں

یہ رستہ ہے ،تو ہو گا ، پر ہمیں کیا
زمیں کے دوست ہیں بیٹھے ہوئے ہیں

برے دن ہیں مگر کچھ ان دنوں بھی
بہت سے واقعے اچھے ہوئے ہیں

میں اب ان آئنوں سے کھیلتا ہوں
جو اُس کے ہاتھ سے چھوٹے ہوئے ہیں

نہیں ہو پائے ہم اپنے یہ دکھ ہے
مگر خوش ہیں کہ ہم تیرے ہوئے ہیں

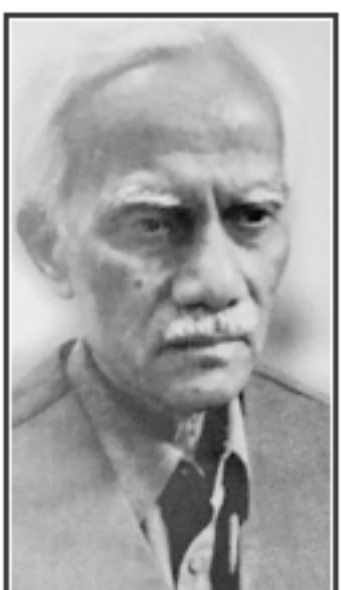

محسن اسرار

غزلیں

گاہے گاہے خاصا مبہم لکھتا ہوں
زخم لگے تو اس کو مرہم لکھتا ہوں

ذہن ہو جس کا چاند اور سوچ ستارا ہو
پاک وطن کا اس کو پرچم لکھتا ہوں

لکھتا ہوں جب لکھنے کی تحریک ملے
سبز ہو جب اندر کا موسم لکھتا ہوں

فکرِ معاش نے چھین لیا ہے رزقِ ہنر
شاعر ہوں اخبار میں کالم لکھتا ہوں

یعقوب پرواز

اپنا کردار نبھانے میں مزا آتا ہے
روتی آنکھوں کو ہنسانے میں مزا آتا ہے

خاص مہمان کی ہوتی ہے جو آمد آمد
دل کے آنگن کو سجانے میں مزا آتا ہے

جاگزیں دل میں جو مقصد کی لگن ہو جائے
اپنا گھر بار لٹانے میں مزا آتا ہے

خال خال ایسے خدوخال کے مالک ہیں جنھیں
دل کی آنکھوں پہ بٹھانے میں مزا آتا ہے

جس کے ذہن میں ہر لحظہ تخریب پلے
اُس کی منفی سوچ کو ایٹم لکھتا ہوں

درویشی کی دی جائے تعلیم جہاں
اُس مکتب کو دارِ ارقم لکھتا ہوں

تب مشہور تھا میں بسیار نویسی میں
لیکن اب پرواز میں کم کم لکھتا ہوں

روٹھنا یاد جو آتا ہے کبھی بچپن کا
اپنے بچوں کو منانے میں مزہ آتا ہے

ان کی پرواز کے معیار کا کیا پوچھتے ہو
جن کو بے پر کی اڑانے میں مزا آتا ہے

غزلیں

دور کیوں بھاگتی ہے خلق خدا مٹی سے
جسم انسان کا سانچے میں ڈھلا مٹی سے

گرداڑاتے ہوئے جاروب کشوں سے نا الجھ
کیا ترا جُسا نہیں خلق ہوا مٹی سے

راستہ دیکھتی رہتی ہے ترا ماں کی طرح
کون مونس ہے ترا پوچھ ذرا مٹی سے

اینٹ سریے کے پجاری تجھے معلوم نہیں
ترا پیکر بھی خدوخال بنا مٹی سے

اصل میں تاج محل خواب ہوا کرتا ہے
اک شہنشاہ کی سوچوں پہ کھلا مٹی سے

گھٹ گئے ہیں مجھے سینے سے لگانے والے
آتی رہتی ہے مسلسل یہ صدا مٹی سے

کیوں نہیں سوچتا یہ آدمی کم بارش سے
موسموں کا بھی تعلق ہے بڑا مٹی سے

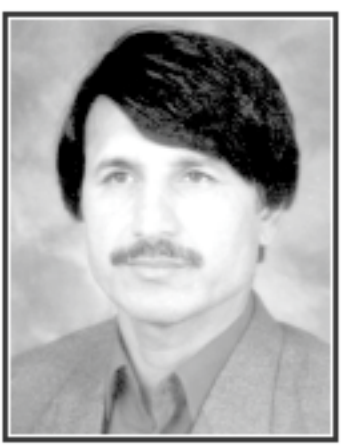

گلزار بخاری

کیوں نہ اعلان ہو اشجار کی غمخواری کا
سب کو معلوم ہے کردار ہے کیا آری کا

مول ذرے کا چکانے کی بھی توفیق نہیں
شوق لیکن ہے بیاباں کی خریداری کا

چند لمحات پہ مبنی ہے ہوس کی لذت
عشق اک سلسلہ ہے دائمی سرشاری کا

اپنی غفلت کا سبب ایک یہی ہے شاید
خواب ہم دیکھتے ہیں نیند میں بیداری کا

اس کی نسلوں کو کڑی دھوپ سے بچتے دیکھا
ذوق جس نسل میں ہوتا ہے شجر کاری کا

اور تقصیر پہ ممکن ہے معافی لیکن
جرم نا قابلِ بخشش ہے دل آزاری کا

لوگ پرواز کی رُت کہتے ہیں جس کو گلزار
وہی موسم ہے پرندوں کی گرفتاری کا

دو غزلہ

ہم ہی ممکن ہے، ترے ناز اُٹھانے لگ جائیں
پہلے یہ زخم پرانے تو ٹھکانے لگ جائیں

تیرے آوارہ چلو ہم ہی رہیں گے، لیکن
یہ نہ ہو، تجھ کو بھلانے میں زمانے لگ جائیں

روک لو اپنے سلگتے ہوئے جذبوں کے شرار
اس سے پہلے کہ کوئی حشر اُٹھانے لگ جائیں

ریزہ ریزہ جنھیں سینے میں بہم رکھتا ہوں
وہی چپکے سے مری خاک اڑانے لگ جائیں

میری جاں! دیکھ یہی وصل کے موسم نہ کہیں
قریۂ گل پہ تگ و تاز اٹھانے لگ جائیں

روکتے روکتے بھی آنکھ چھلک اٹھتی ہے
کیا کریں، دل کو اگر روگ پرانے لگ جائیں

تم نے باندھا ہے جنھیں تارِ نظر سے خالد
وہی دریا نہ کہیں آگ لگانے لگ جائیں

.....

یوں جو دنیا سے رہ و رسم بڑھانے لگ جائیں
ہم بھی انبار خس و خاک اُٹھانے لگ جائیں

سیرگاہِ فلک آثار سے آئے ہوئے ہم
خاک کے دائرے میں عکس بنانے لگ جائیں

ہم نکل آئیں اگر اپنی انا سے باہر
آسماں کی طرح پورے نظر آنے لگ جائیں

وحشتِ دل سے زیادہ کریں وحشت اُس کی
بے شک اس کام میں دو چار زمانے لگ جائیں

ہجر کے دشتِ تپیدہ سے گزرنے والے
ڈر رہا ہوں، کہیں سورج نہ بجھانے لگ جائیں

ٹوٹ جاتے ہیں سبھی عکس، اگر شہر کے لوگ
آئینہ گر کو بھی آئینہ دکھانے لگ جائیں

عین ممکن ہے کنارے کی طلب میں خالد
ہم بھنور توڑ کے لہروں کو بچانے لگ جائیں

خالد علیم

غزل

وفا کے باغ میں سب کچھ ہے ایک تو کم ہے
اسی لیے تو گلابوں میں رنگ و بو کم ہے

پلک پلک پہ سجاؤں بساؤں دل میں تجھے
خیالِ یار بتا ! تیری آبرو کم ہے

کِھلا نہیں ہے کسی پھول کا ابھی رستا
سفر پہ جانے کی ویسے بھی آرزو کم ہے

ترے کرم کا ہے احساں مگر مَیں کیسے کہوں
کہ پیاس جتنی ہے اُس کے لیے سبُو کم ہے

وہ جس نے زیست میں صدیوں کے رنگ بھرنے ہیں
ہے دکھ یہی کہ اُسی پل کی جستجو کم ہے

کسی سے مل کے بھلا کیا سکوت ٹوٹے گا
کہ اِن دِنوں مری خود سے بھی گفتگو کم ہے

مری تلاش میں نکلا نہیں جو گھر سے کبھی
اُس ایک شخص کی مجھ کو بھی جستجو کم ہے

پڑا ہوا ہُوں کسی گم شدہ حویلی میں
کہ میرے شہر میں پہلی سی ہاؤ ہُو کم ہے

تمھارے رخ کی ملاحت پہ ہیں نثار سبھی
تمھارے جیسا زمانے میں خوب رُو کم ہے

نثار ترابی

غزل

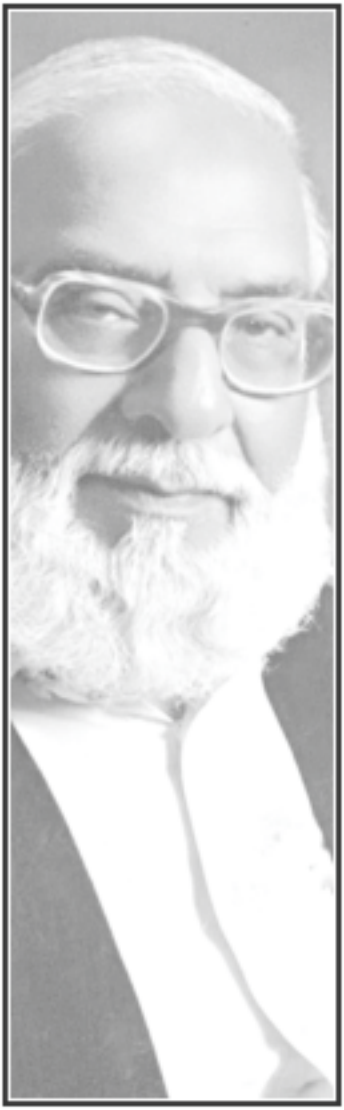

گلاب رت نے عطائیں عنایتیں کیا کیا
چمن کے رنگ میں دیکھیں کرامتیں کیا کیا

عجیب روپ ہیں چہرے دمکتے دیکھے ہیں
مگر دلوں میں ہیں پنہاں کثافتیں کیا کیا

رکا ہوا ہے رواں زندگی کا دھارا عجب
درونِ خانہ چلی ہیں سیاستیں کیا کیا

ہمارا نام محبت ، ہمارا کام وفا
ہمارے دم سے ہیں قائم سفارتیں کیا کیا

یہ روز روز کے وعدے اور ان کا توڑ بھی روز
نئے ستم کی ہیں قائم روایتیں کیا کیا

اسی خیال سے آنکھوں میں کچھ نمی سی ہے
ہمارے نام رقم ہیں شکایتیں کیا کیا

ہر ایک بات پہ ہنگامہ سر اٹھاتا ہے
ملاپ میں بھی ملی ہیں کدورتیں کیا کیا

غزل ریاض کے جذبِ دروں کا جوہر ہے
متاعِ دل کو عطا ہیں حرارتیں کیا کیا

سید ریاض حسین زیدی

غزلیں

کیسے بتلاؤں کہ کیا تھا دلِ بے تاب کا حال
آنکھ کھُلنے پہ کہاں رہتا ہے وہ خواب کا حال

مَیں نے پوچھا تو مرے گاؤں سے آئے ہُوئے ہنس
مجھ سے کہنے لگے مت پوچھیے تالاب کا حال

رسمِ تعظیم ہی باقی ہے نہ اَب رسمِ وفا
کیا سے کیا کر دیا اِس دَور نے آداب کا حال

لاکھ توضیحِ تلاطم کریں لیکن صاحب
عینِ گرداب میں ہی کُھلتا ہے گرداب کا حال

تھرتھرانے لگے جب عمر کی لو ہی خاور
خود سے بھی دیکھا نہیں جاتا ہے اعصاب کا حال

خاور اعجاز

بحر ہی خشک نہ کر جائیں نئی لہر کے لوگ
کے برس اور مسلط ہیں یہ دوپہر کے لوگ

ساتھ چلتے بھی نہیں راہ سے ہٹتے بھی نہیں
مِری بستی میں اُمڈ آئے ہیں کس شہر کے لوگ

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ شفا کس میں ہے
کبھی تریاق کے ہوتے ہیں کبھی زہر کے لوگ

حشر کے بعد بدل جائے گا سب کچھ لیکن
رونق افروز وہاں ہوں گے اِسی دہر کے لوگ

مَیں مضافات کا شہزادہ رہا ہُوں خاور
مجھ سے جلتے ہیں اِسی واسطے اِس شہر کے لوگ

غزل

تھک گئیں تو کہاں اُترنے لگیں
آگ میں تتلیاں اُترنے لگیں

میری جلتی، سلگتی آنکھوں میں
بن کے یادیں دھواں اُترنے لگیں

کیا بتاؤں کہ کر کے یاد اُسے
دِل میں کیا برچھیاں اُترنے لگیں

خواب کے آئنے میں عکس اُبھرا
عکس میں کرچیاں اُترنے لگیں

خار کچھ اور سُوکھ جانے لگے
گُل میں شادابیاں اُترنے لگیں

آسماں اِک غُبار میں ملفوف
دُھند میں سیڑھیاں اُترنے لگیں

ناخُداؤں کی مہربانی سے
ریت میں کشتیاں اُترنے لگیں

دِل کی تاریکیوں میں کچھ یادیں
صورتِ کہکشاں اُترنے لگیں

شاعری کے طِلسم خانے میں
اُس کی رعنائیاں اُترنے لگیں

جانے مُرغابیوں نے کیا دیکھا!
سرِ آبِ رواں اُترنے لگیں

اُس کے جانے کے بعد مجھ میں نسیم
کتنی تنہائیاں اُترنے لگیں

نسیمِ سحر

غزل

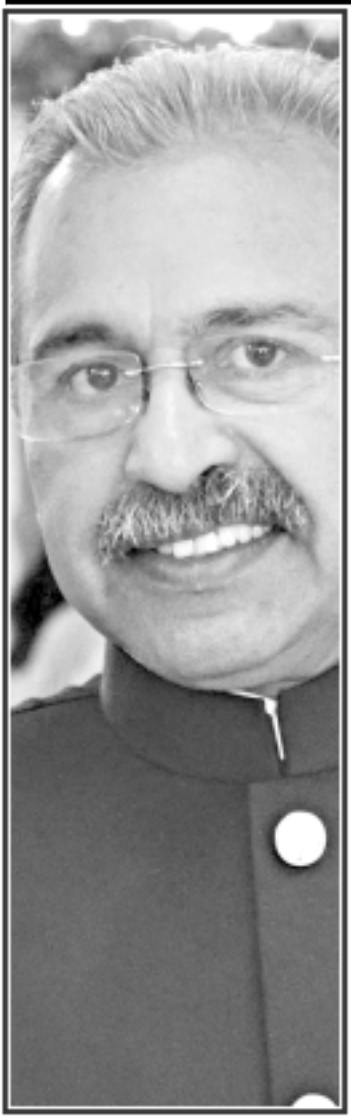

بیان ان میں بہت سی بشارتیں کی ہیں
سپردِ لوح جو ہم نے عبارتیں کی ہیں

ہماری سادہ دلی دیکھ سب سمجھتے ہوئے
تمھارے جیسوں نے ہم پر صدارتیں کی ہیں

دکھوں نے عہدِ لڑکپن میں کر دیا بوڑھا
نہ کھیلے کودے نہ ہم نے شرارتیں کی ہیں

ہمیں سمجھ کے برائے فروخت دنیا نے
بنا بتائے ہماری تجارتیں کی ہیں

نہ آسمان نظر آتا ہے نہ رات نہ دن
بلند لوگوں نے اتنی عمارتیں کی ہیں

کھلے ملے ہیں حویلی کے چور دروازے
عبور کرنے کی جس نے جسارتیں کی ہیں

کسی حسیں کے نشیب و فراز دیکھے ہیں
کہ میں نے چودہ طبق کی زیارتیں کی ہیں

دکھائی صرف اسے دے گا میرا دکھ راحت
کہ پاک اشکوں سے جس نے بصارتیں کی ہیں

راحت سرحدی

غزل

کہا کیا دل لگی کا سلسلہ اچھا نہیں لگتا
کہا لگتا ہے لیکن برملا اچھا نہیں لگتا

انہیں اظہار کی خواہش کی عریانی نہیں بھاتی
ہمیں پیراہنِ عز و جا اچھا نہیں لگتا

خدا جانے عدو سے کب ہماری جان چھوٹے گی
کہا ترکِ تعلق کا کہا اچھا نہیں لگتا

کہا کیا ختم بھی ہوں گی کبھی یہ ہجر کی راتیں
کہا انساں کوئی کم حوصلہ اچھا نہیں لگتا

کہا کچھ تو مری مجبوریوں پر رحم، یوں بولے
ہمیں یہ جامۂ مکر و ریا اچھا نہیں لگتا

کبھی اچھی نہیں لگتیں ہمیں خوشیاں زمانے کی
کبھی ساجد اگر ہو غم زدہ اچھا نہیں لگتا

شریف ساجد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس رنگ شب و روز گزرتے رہے خالد
وہ پوچھ تو لیتے ہیں بتانے نہیں دیتے

غزل

رونے والی روشنی کا کیا کریں
اب چراغ اپنی نمی کا کیا کریں

آسماں سے، کون ہیں، جو آ کے روز
پوچھتے ہیں آدمی کا کیا کریں

گھر کے حصّے ہو چکے اور اب سوال
اِس گلی کا ہے، گلی کا کیا کریں

اُس کی آنکھیں دیکھیے اور جانیے
اِتنی ساری روشنی کا کیا کریں

ہم تو خود تیری نظر میں چھٹ گئے
ہم کسی کی بے بسی کا کیا کریں

ایک ہی بار آئے اور جائے نظر
بار بار آئی گئی کا کیا کریں

آسماں جن کا نہ کچھ بھی کر سکا
وہ ستارے پھر کسی کا کیا کریں

میں ہنسا تو ہوں مگر تاخیر سے
لوگ اب میری ہنسی کا کیا کریں

آسماں تو آنی جانی چیز ہے
سو زمینِ دائمی کا کیا کریں

جو خلافِ واقعہ ٹھہرے ملول
وہ ملالِ واقعی کا کیا کریں

چار دیواری کو اپنے بھی ہیں کام
چار دیواریں کسی کا کیا کریں

گھر میں آتی اِتنی گلیاں ہیں کہ بس
گھر کو جاتی اِس گلی کا کیا کریں

شاہین عباس

غزلیں

دیکھنا تھا مگر نہیں دیکھا
ٹکٹکی باندھ کر نہیں دیکھا
ایسے لپٹی ہے پاؤں سے ہجرت
ایک مدت سے گھر نہیں دیکھا
اس نے اقرار کے دریچے سے
آج بھی جھانک کر نہیں دیکھا
راہِ دشتِ جنوں کے راہی نے
پاؤں دیکھے ہیں سر نہیں دیکھا
تیرے دستِ عطا کی بخشش نے
بے ہنر، باہنر نہیں دیکھا
ایسی برسات کی ہے جلووں کی
دامنِ دیدہ ور نہیں دیکھا

خواب میں ایک بار دیکھا تھا
پھر تجھے عمر بھر نہیں دیکھا
تیرے کُوچے سے جب نکل آئے
پھر پلٹ کر ادھر نہیں دیکھا
میرے چھالوں کو دیکھنے والے
تُو نے میرا سفر نہیں دیکھا
پھر کسی کام کی نہیں آنکھیں
تم نے اس کو اگر نہیں دیکھا
جو شجر سربلند ہو شاہد
ہم نے وہ بارور نہیں دیکھا

افتخار شاہد

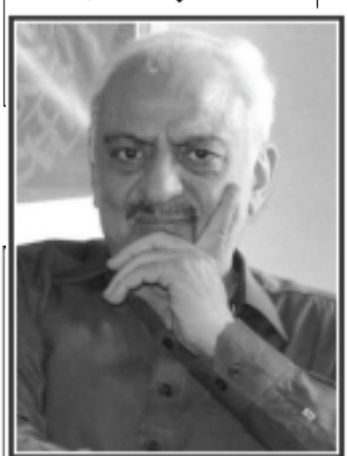

ایسے وہ شخص مرا وہم و گماں کھینچتا ہے
جیسے بھٹکے ہوئے راہی کو دھواں کھینچتا ہے
دن کے کاموں میں تری یاد نہیں بھی آتی
شام ڈھلتی ہے تو یہ کارِ زیاں کھینچتا ہے
بعد میں تیز ہوائیں ہی مٹا دیتی ہیں
ورنہ ہر شوق یہاں اپنے نشاں کھینچتا ہے
مجھ کو سوچے تو چمک اٹھتی ہیں آنکھیں اس کی
مجھ کو دیکھے تو وہ ابرو کی کماں کھینچتا ہے
پہلے آنکھوں میں تری یاد کا پانی اترے
پھر ترا دردِ مری ریگِ رواں کھینچتا ہے

زندگی درد کی صورت کے سوا کچھ بھی نہیں
یہ وہ گاڑی ہے جو ہر پیر و جواں کھینچتا ہے
چپکے رہنے کا بھی شکوہ ہے زمانے کو مگر
بول اٹھوں تو زمانہ ہی زباں کھینچتا ہے
ڈھونڈیے اور کوئی دشت بچانے والا
عشق والوں کو تو اب کارِ جہاں کھینچتا ہے

غزل

بس تری یادوں میں ہم غرق رہا کرتے ہیں
اس طرح جان ترے بعد جیا کرتے ہیں

یاد آتے نہیں اندازِ ستم اب ان کے
دل کے زخموں کو چلو پھر سے ہرا کرتے ہیں

پرسکوں اور یہ خاموش سا من ہے جو مرا
اس میں طوفان بھی رہ رہ کے اٹھا کرتے ہیں

تم بہت سوچ سمجھ کر ہمیں کھونا یارو
ہم جدا ہو کے نہیں پھر سے ملا کرتے ہیں

کتنے انمول گہر ہیں جو مری پلکوں پر
دردِ تنہائی کی ٹیسوں سے سجا کرتے ہیں

انتظاروں کا فقط لوٹتے رہتے ہیں مزہ
ہم کہاں وصل کے چکر میں پڑا کرتے ہیں

جانتے ہیں کہ وہ ہرگز نہیں آنے والا
ایک ٹک اس کی مگر راہ تکا کرتے ہیں

یہ ہیں مرجھاتے اسی پر ہی وفا تو دیکھو
جس پہ نازک سے حسیں پھول کھلا کرتے ہیں

حسنِ اخلاق کا میرے ذرا دیکھو تو اثر
میرے دشمن بھی مرے حق میں دعا کرتے ہیں

اپنی مرضی سے جب اک سانس بھی لے سکتے نہیں
آخرش کس لئے ہم اتنا اڑا کرتے ہیں

بن گیا عشق "ذکی" پیار ہمارا کب کا
اس کا ہم جسم نہیں روح چھوا کرتے ہیں

ذکی طارق

غزل

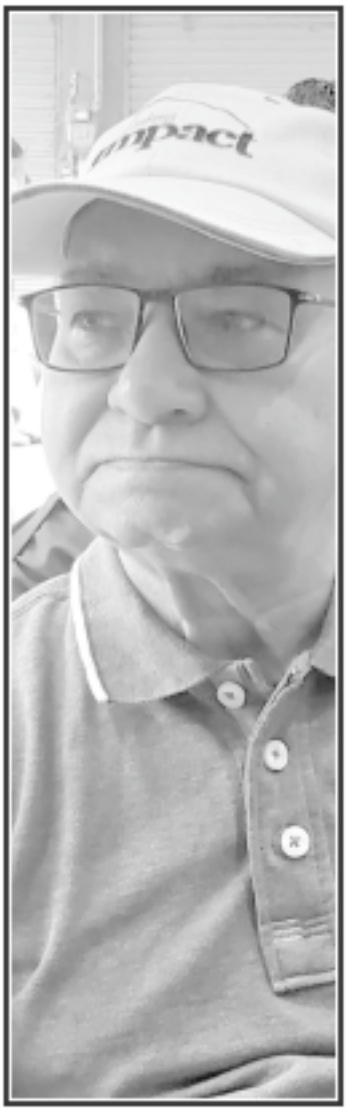

ہر کسی کے ہے پاس آئینہ
پَر کہاں سَب کو راس آئینہ

کبھی چہرہ خوشی دکھاتا تھا
آج کیوں ہے اداس آئینہ

اپنا چہرہ بھی بھول جاتا ہوں
اب میں رکھتا ہوں پاس آئینہ

ہَم جوانوں کو پیر دکھلائے
کھا گیا ہے یہ گھاس آئینہ

پہلے دکھلائیں وہ سیہ زلفیں
اَب دکھائے کپاس آئینہ

ہڈیاں اب اُبھر کے آتی ہیں
پہلے ہوتا تھا ماس آئینہ

پردہ کوئی رَوا نہیں اعجاز
اَب رہے بے لباس آئینہ

اجمل اعجاز

غزل

یاد ہے اب تک ترا وہ ، اک کبوتر چھوڑنا
اور پھر بے تاب ہو کر، اُسکے پیچھے دوڑنا

کعبۂ احساسِ دل اور دل مدینہ درد کا
دل کسی انسان کا، بُھولے سے بھی مت توڑنا

عارضی ہے اِس جہانِ رنگ و بو کی زندگی
اس جہاں میں عاجزی سے منہ نہ ہرگز موڑنا

مر چکا ہے وہ کبھی کا ، ہے تمہیں جس کی تلاش
اب ضمیر آدمیت کس لیے جھنجھوڑنا

کر دیا غربت نے کیسا اِس قدر عورت کا حال
چلچلاتی دُھوپ میں سڑکوں پہ پتھر توڑنا

وقت تو مرہم کسی کے زخم پر رکھتا نہیں
وقت کی دیوار سے تم، سر کبھی مت پھوڑنا

ہر کسی سے نفرتوں کی داستاں کہتے ہیں لوگ
جانتے ہیں کم ہی دل کے، آئنوں کو جوڑنا

ہائے مرگِ آرزو مرقد پہ اب آئے گا کون
ہو سکے اقبال اِس پہ چُپ کی چادر اوڑھنا

اقبال سرو بہ

غزل

یہی رہا ہے ہر اک سے، گِلہ محبت کا
بنے گا اتنی محبت سے کیا محبت کا

یہ تاج و تخت یہ جان اور عزت و ناموس
لُٹا کے یہ بھی، نہ کچھ بن سکا محبت کا

میں اپنی جان بچاتا تو اس پہ کیا بِکتی
وہاں نہ تھا کوئی میرے سوا محبت کا

ہوس کی تنگ گلی راستے میں پڑتی تھی
وہاں میں بھول گیا راستہ محبت کا

سوال میں خط کے لفافے پہ کچھ نہیں لکھتا
یہی تو خالی ورق تھا پتہ محبت کا

خبر کہاں اُسے دُنیا جہان کی ہو گی
وہ جس نے چکھا نہیں ذائقہ محبت کا

رانا سعید دوشی

غزل

رنج ملتا ہے تو بس رنج اٹھاتے جائیں
خوش رہیں اہلِ وفا عشق نبھاتے جائیں

خود بخود چار طرف پھول نکل آئیں گے
آپ دو چار قدم ساتھ تو آتے جائیں

کتنے نادان ہیں اس باغ کے رہنے والے
پھل کی امید کریں پیڑ گراتے جائیں

آپ کے ہاتھ سے گل پاشی کی امید نہیں
پاؤں سے راہ کے پتھر تو ہٹاتے جائیں

رہ گیا ہے یہی اک کام مرے خوابوں کا
روز امید پہ امید دِلاتے جائیں

دشت میں پیدا کریں تیز ہواؤں کا جواز
برسرِ ریگ کوئی نقش بناتے جائیں

تا کہ تنہائی سے تادیر ملاقات کروں
آپ جاتے ہوئے دروازہ لگاتے جائیں

طالب انصاری

غزل

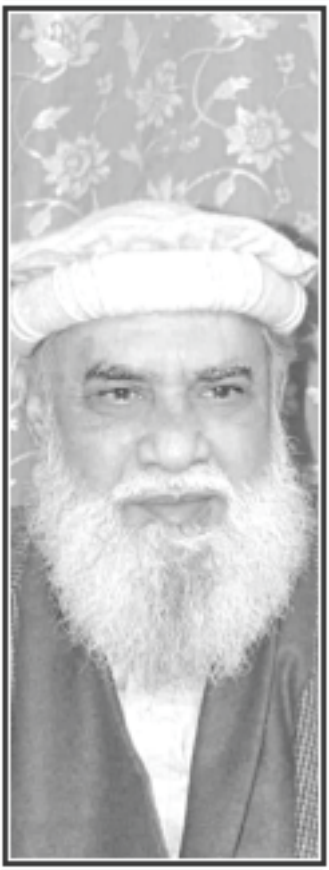

غور کر ، سوچ سمجھ ، پھر نہ شکایت کرنا
راہ مشکل ہے ، سفر لمبا ہے ، ہمت کرنا

اے خدا، چاروں طرف دشمنِ دیں گھات میں ہیں
امتِ احمدِ مرسل کی حفاظت کرنا

میں ترا ساتھ بھلا کیسے نبھا سکتا تھا
میری فطرت میں ہے ظالم سے بغاوت کرنا

موج مستی انہیں کرنے دے تو قدغن نہ لگا
فطری حق ہوتا ہے بچوں کا شرارت کرنا

میں مسلماں ہوں، مرے رب کا کرم ہے مجھ پر
ہے رگ و ریشہ میں آقا کی اطاعت کرنا

میں تو اس کام میں پڑنے کا نہیں تھا اکرم
اس نے خود مجھ کو سکھایا تھا محبت کرنا

اکرم ناصر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس قدر کرب سے اک کرب کا اظہار ہُوا
عجز اظہار مری راہ کی دیوار ہُوا

غزل

نیند کے پار تیرتے خواب اُتر کے دیکھتے
عمر میان میں کٹی آب اُتر کے دیکھتے

شور میں کارتوس کے خواب بکھر کے رہ گئے
مرغ نے سوچا تھا کہ تالاب اُتر کے دیکھتے

کھڑکی سے زندگی کا لمس آپ کو کیا پتا چلا
کار کو روکتے کہیں صاب اُتر کے دیکھتے

جسم کے سبز باغ سے کیوں بے خبر گزر گئے
ہونٹ کا پھول آنکھ نیلاب اُتر کے دیکھتے

پاس کے پتھروں سے ہی سارا مکالمہ رہا
جھیل سے گفتگو تھی پایاب اُتر کے دیکھتے

اوس کی دل لگی سے تھا ان کا معاملہ الگ
شاخِ برہنہ پر گل آفتاب اُتر کے دیکھتے

منظرِ گل کی کچھ خبر؟ اور پرندگان کی؟
باغ کے عکس میں جو تھا غاب اُتر کے دیکھتے

منظر اعجاز

غزل

چھت کا پنکھا نکال رکھا ہے
ایک چڑیا کو پال رکھا ہے

مجھ میں کیسا کمال رکھا ہے
عمر بھر کا زوال رکھا ہے

بپھرے دریا کے پار جانے کو
ایک تنکا سنبھال رکھا ہے

میرے ماں باپ کی دعاؤں نے
ہر مصیبت کو ٹال رکھا ہے

اِک شکستہ چراغ کی لو نے
میرا ماضی اُجال رکھا ہے

کرکے میں نے رہا سبھی پنچھی
خود کو پنجرے میں ڈال رکھا ہے

جھُریاں جو پڑی ہیں چہرے پر
اِن میں ماضی سنبھال رکھا ہے

میر و غالب ، فراز و فیض مرے
ربط سب سے بحال رکھا ہے

اک حویلی کی بند کھڑکی میں
کس کا حُسن و جمال رکھا ہے؟

رُخِ جاناں کی روشنی نے عقیل
شاعری کو اُجال رکھا ہے

عقیل رحمانی

غزل

یہ مہر و ماہ کا ہر منظرِ طلوع و غروب
بنامِ خلق ہے خالق کا نکتہ زا مکتوب

یہ شان و شوکتِ دُنیا، یہ مال و زور کی ہوس
کرے گا ترک وہی، جو خدا کا ہے محبوب

مِرے خدا! جو چھپاتا رہا تُو دُنیا میں
نہ کرنا فاش دمِ حشر بھی، میرے وہ عیُوب

جلال عزمِ شہادت ہوا کسی کا نہ کم
چڑھا ہے دار پہ کوئی، ہوا کوئی مصلوب

ہر اَمر جانتا ہے رب ہی، گرچہ دُنیا میں
کوئی سمجھتا ہے خوب اُن کو، اور کوئی ناخوب

نبی کبھی نہیں چلتا، امورِ حق کے خلاف
اُسی کا حکم سُناتا ہے، جس کا ہے مندوب

ہر ایک دور میں یہ انکسار و عجز و نیاز
کیے گئے مِری کمزوریوں سے ہی منسوب

کوئی ہے ان میں سبب اور کوئی مسبب ہے
سدا ہیں لازم و ملزوم، ضارب و مضروب

جہاں میں جس نے غلط کو غلط کہا ہر دم
نگاہِ اہلِ جہاں میں سدا رہا معتوب

سید قاسم جلال

غزلیں

ہیں مراسم نہ شناسائی ہے
شہر اب باعثِ رسوائی ہے

دشت چھوڑا ہے غلط فہمی میں
گھر میں کچھ اور بھی تنہائی ہے

منجمد ہو گئے سب فکر و خیال
برف سوچوں پہ اتر آئی ہے

درد پٹیوں کہ میں خنجر چوموں
میرا قاتل جو میرا بھائی ہے

عشق کا دل کہ دھڑکتا ہے ابھی
جان کہ اُس کی تمنائی ہے

پھول خوشبو سے جلن رکھتے ہیں
کیسی گلشن میں یہ رُت آئی ہے

شب میں روشن جو دیا ہے ناظر
دل سلگنے کی جزا پائی ہے

اقبال ناظر

متاعِ جان! عجب سرخوشی کا حکم ہوا
سبُو کو توڑ کے پھر مے کشی کا حکم ہوا

سوادِ جان کہ جتنے چراغ روشن تھے
بجھا کے سارے دیے روشنی کا حکم ہوا

یہاں مفاد میں بٹتا گیا ہے لوگوں کو
عداوتوں کا کبھی دوستی کا حکم ہوا

برائے عدل جو رسوا ہوئے زمانے میں
بنامِ عدل انہیں خودکشی کا حکم ہوا

خزاں کے دور میں مانگے گئے گلاب نئے
زمینِ سنگ پہ روئیدگی کا حکم ہوا

امیرِ شہر کی عشرت پہ کوئی حد نہ لگی
غریبِ شہر کو بس سادگی کا حکم ہوا

غموں کی ڈال کے زنجیر پاؤں میں ناظر
پھر اس پہ ظلم ہمیں خوش دلی کا حکم ہوا

غزل

یہی تو ہے مرے دل کو ملال مدت سے
کسی نے پوچھا نہیں میرا حال مدت سے

ہے بے نیاز مہ و سال سے جمال اسکا
اسی طرح سے ہے وہ بے مثال مدت سے

یونہی درخشاں و تاباں ہے وہ زمانوں سے
یونہی فروزاں ہے اس کا جمال مدت سے

الجھ کے رہ گیا کن الجھنوں میں وہ جانے
جواب ڈھونڈ رہا ہے سوال مدت سے

بچھائے بیٹھے ہیں آنکھیں چمن کے پھول سبھی
اسی کی منتظر بادِ شمال مدت سے

کسی زوال نہ پاتال کا اسے خدشہ
ملا ہے اس کو وہ اوج و کمال مدت سے

وہ کیسے پوچھنے آیا ہے میرا حال جلیل
جسے نہ آیا ہو میرا خیال مدت سے

احمد جلیل

غزل

سمجھے نہیں جناب سمجھنا پڑا ہمیں
جگنو کو ماہتاب سمجھنا پڑا ہمیں

اس زندگی کو عمر بھر ان پر گھسیٹ کر
کانٹوں کو بھی گلاب سمجھنا پڑا ہمیں

تیری طرف سے تو وہ سراسر سوال تھا
لیکن اسے جواب سمجھنا پڑا ہمیں

جن رہزنوں نے ہمکو رگیدا تھا راہ میں
انکو بھی ہمرکاب سمجھنا پڑا ہمیں

مشکل سے اسکو شہد بنایا تھا بعد میں
اس شہد کو شراب سمجھنا پڑا ہمیں

آتش بھڑک رہی تھی عجب انتقام کی
لیکن وہ احتساب سمجھنا پڑا ہمیں

اپنے برے بھلے کی برابر تمیز تھی
اچھا تھا وہ خراب سمجھنا پڑا ہمیں

غرقاب کر کے آ گئے کشتی کو ریت میں
دریا کو پھر سراب سمجھنا پڑا ہمیں

ویسے تو زندگی یہ گناہوں کا بوجھ تھی
پھر بھی اسے ثواب سمجھنا پڑا ہمیں

مسعود نظریہء ضرورت کے تحت پھر
ذرے کو آفتاب سمجھنا پڑا ہمیں

مسعود احمد

غزل

دنیا بھی چل رہی ہے عبادت کے ساتھ ساتھ
کچھ کام کاج بھی ہیں محبت کے ساتھ ساتھ

رکھتا ہوں اپنے پاس میں کاغذ قلم کہ یوں
کچھ تو سکوں ملے گا مشقت کے ساتھ ساتھ

کڑوی دوا میں شہد ملا کر پلا مجھے
کچھ چھیڑ چھاڑ بھی ہو نصیحت کے ساتھ ساتھ

انجام کار مارے نہ جانا مری طرح
لازم ہے احتیاط بھی ہمت کے ساتھ ساتھ

گویا کہ میرے عیب و ہنر جانتا ہے وہ
ہے جس کو مجھ سے پیار بھی نفرت کے ساتھ ساتھ

اپنوں کی بے وفائی کا ہے سامنا مجھے
سو آنکھ میں نمی بھی ہے، حیرت کے ساتھ ساتھ

دہلیز چومتا ہوں میں سجدہ کیے بغیر
توحید بھی رہے گی عقیدت کے ساتھ ساتھ

دل میرے ساتھ بھی ہے، مخالف کے ساتھ بھی
گو رسمِ دوستی ہے بغاوت کے ساتھ ساتھ

آنکھوں کو خیرہ کر گئی چہرے کی چاندنی
میں دل میں جھانک پایا نہ صورت کے ساتھ ساتھ

اے نیند دینے والے کوئی خواب بھی تو دے
مصروفیت بھی چاہیے فرصت کے ساتھ ساتھ

آئے گا تم کو راس علمدار عجز ہی
کچھ حسن بھی تو ہو نا رعونت کے ساتھ ساتھ

علمدار حسین

غزلیں

زمیں نے جذب کیا پانی میں بہایا ہوا
کسی پہ خرچ تو کرنا ہی تھا کمایا ہوا

پروں میں چونچ دبائے پرند بیٹھے ہیں
ہوا نے توڑ دیا گھونسلہ بنایا ہوا

کُھلے پڑے در و دیوار قتل گاہوں کے
کِسی کے کھانے میں بھی زہر تھا ملایا ہوا

یہ سانس پھولتی جاتی تھی زور چلتا نہ تھا
رویہ سخت ترا میرے مُنہ کو آیا ہوا

چلو بجائیں کوئی گیت حسبِ حال ایسا
کسی کو وعدہ نہیں یاد ، اک بُھلایا ہوا

اُٹھا تو فیصلہ حق میں اُسی کے ہو چکا تھا
جو اپنے ساتھ شہادت نہیں تھا لایا ہوا

رخشندہ نوید

کر کسی اور کے دل کا بھی کبھی خوں ایسا
تُو مرے ساتھ ہی کرتا ہے بھلا کیوں ایسا

حسن آویزاں رہے چہرہ باریش پہ بھی
عشق میں کم ہی کوئی ہوتا ہے مجنوں ایسا

اس کے جیسا نہ کہیں ایک بھی پایا جائے
اپنے محبوب کا معیار ہی کچھ دوں ایسا

جب بھی دریا کے کنارے پہ کوئی بیٹھا ہو
ایسے لگتا ہے، کہ ہے دور وہ کوسوں ایسا

مجھ سے ہوتی ہی نہیں تلخ کلامی اے دوست
کاش کہ میں بھی جواب اس کو کبھی دوں ایسا

غزل

عبث وجود کا دکھ ، تنگیٔ حیات کا دکھ
کہ دل نے پالا ہوا ہے ہر ایک ذات کا دکھ

تلاشِ جنت و دوزخ میں رائیگاں ، انساں
زمیں پہ روز مناتا ہے کائنات کا دکھ

کئی جھمیلوں میں الجھی سی بدمزہ چائے
اُداس میز پہ دفتر کے کاغذات کا دکھ

تمام دن کی مصیبت تو بانٹ لی ہم نے
کبھی کہا ہی نہیں اپنی اپنی رات کا دکھ

گئے دنوں کا کوئی خواب دفن ہے شاید
کہ اب بھی آنکھ سے رستا ہے باقیات کا دکھ

امامِ تشنہ کی اولاد ٹھہری ہوں آخر
سو مجھ کو یکساں ملا راوی و فرات کا دکھ

نہ جانے مالکِ ''کُن''، کس طرح نبھاتا ہے
یہ دسترس کی سہولت ، یہ ممکنات کا دکھ

صائمہ آفتاب

غزلیں

ساری حقیقت جان کر بھی خوش گمانی میں رہے
ہم زندگی کی شام تک تیری کہانی میں رہے

خیرات میں اس نے عطا کر دی مجھے پھر زندگی
زندہ رہے جتنا اجل کی پاسبانی میں رہے

ہم تو سدا چلتے رہے تیری طرف اے دوستا
سوئے سمندر جس طرح دریا روانی میں رہے

مرزا سکندر بیگ

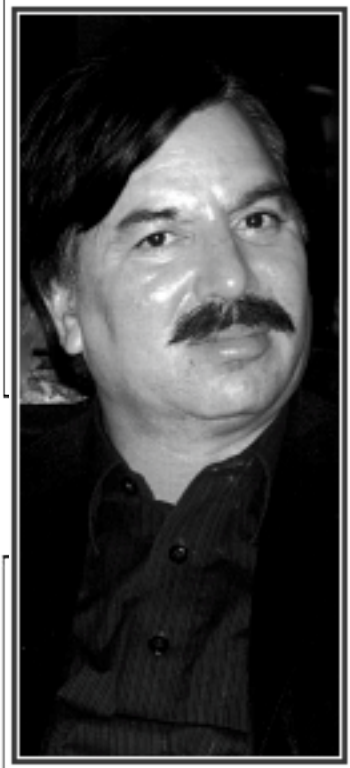

ہم فقیروں کو ٹھکانہ مل گیا
پھر وہی صحرا پرانا مل گیا

جب اکیلا ہی مکیں تھا دشت میں
قیس کا پورا گھرانہ مل گیا

خاک مل کر چھانتے ہیں رات دن
ریت میں جیسے خزانہ مل گیا

شہرِ ستم میں زندگی ہم نے گزاری اس طرح
جیسے سکندر ظالموں کی حکمرانی میں رہے

ساتھ تیرا کیا ملا اے زندگی
اور جینے کا بہانہ مل گیا

کون ہے ہم سا سکندر دوسرا
ایک کاسے میں زمانہ مل گیا

غزلیں

اسی لئے تو زمانے سے اجتناب کیا
ترے فقیر کو اِس نے بہت خراب کیا

چلے گئے تھے مرے سامعین سو میں نے
اُداس اُداس ہو کے در و بام سے خطاب کیا

تری نگاہ نے یکسر بدل دیا مجھ کو
تری نگاہ نے ذرے کو آفتاب کیا

کہا ہے آج بھی جا کر یہ میر سے میں نے
تری غزل نے غزالوں کو لا جواب کیا

مجھے خوشی ہے کہ انصر بھرے زمانے سے
مرے بڑوں نے محبت کا انتخاب کیا

انصر حسن

اتنا میٹھا بول رہے ہو خیر تو ہے
دل دروازہ کھول رہے ہو خیر تو ہے

خالص ہے تو بھائی خالص رہنے دو
شہد میں کنکر گھول رہے ہو خیر تو ہے

میرے سامنے اور مری موجودگی میں
غیر کو اپنا بول رہے ہو خیر تو ہے

پورے پیسے لے کر مجھ سے یار مرے
تھوڑا سودا تول رہے ہو خیر تو ہے

خیر تمہاری بے اندیش جوانی کی
انصر ڈگمگ ڈول رہے ہو خیر تو ہے

غزل

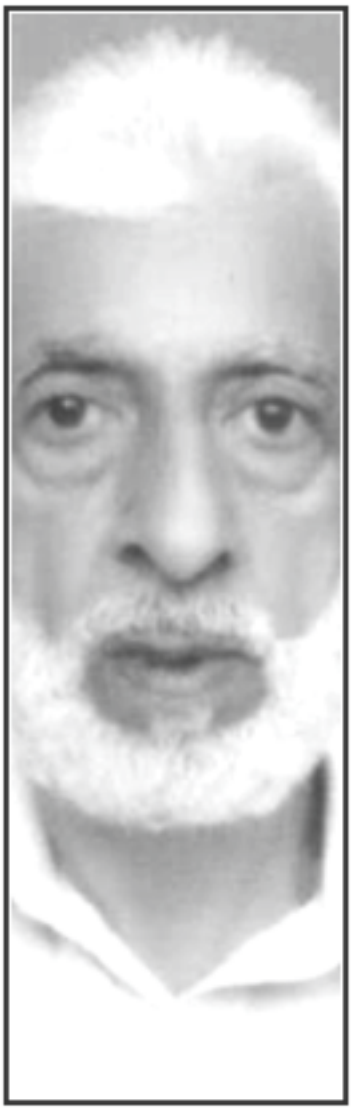

جو ہمارے لہو سے پلتے ہیں
زہر ہم پر وہی اُگلتے ہیں

ہیں درندے بشر کے رُوپ میں وہ
پھول پیروں سے جو مسلتے ہیں

کوئی حسرت نکل نہیں پاتی
رات دن اس طرح بھی ڈھلتے ہیں

دوستی آپ سے نہیں ہو گی
آپ تو آئنے بدلتے ہیں

کِھل رہی تھیں جہاں پہ اُمیدیں
شامیانے وہیں پہ جلتے ہیں

پھول کھلتے ہیں ریگزاروں میں
جب بھی سج دھج کے وہ نکلتے ہیں

صرف سورج نہیں جلا شاہد
چاند تارے بھی ہم سے جلتے ہیں

ہمایوں پرویز شاہد

غزل

وحشت میں ہم دُور نکل آئے گھر سے انجانے میں
گزری ہے پھر عمر ہماری صحرا میں، ویرانے میں

کیسے دُور رکھو گے خود کو دنیا کی رُسوائی سے
نام تمہارا بھی شامل ہے چاہت کے افسانے میں

اب تو خیر منائے دنیا مئے خواروں کی دنیا سے
زاہد سارے آ بیٹھے ہیں شام ڈھلے مے خانے میں

مدہوشی میں ہوش کی باتیں کرتا ہے کس شان سے یہ
فرزانوں کی ساری خصلت دیکھی اِس دیوانے میں

شمع تو جلتی ہی رہتی ہے محفل میں تا دیر مگر
جل جانے کی خو پوشیدہ رہتی ہے پروانے میں

ہم سے کچھ مئے خوار ہمیشہ پیرِ مغاں سے چُھپ چُھپ کر
رکھ لیتے ہیں کل کی خاطر تھوڑی سی پیمانے میں

عشق اِسی کو کہتے ہیں اور عشق کا ہے مفہوم یہی
خود مٹ کر بھی چاہت بانٹو اپنے میں، بیگانے میں

واعظ، شیخ، مبلغ سارے چھوڑ کے اپنی دنیا کو
رات گئے چُھپ چُھپ کر آخر آتے ہیں بت خانے میں

طے مسافت ہو جاتی ہے اِک دنیا کی روز ندیمؔ
''صبح کو گھر سے دُور نکل کر شام کو واپس آنے میں''

ریاض ندیم نیازی

غزل

دل امبر سے ٹوٹا تارہ
دل امبر کا تنہا تارہ

دل پر بجلی جیسے کڑکی
امبر پار جو چمکا تارہ

یار ابھی تو رات پڑی تھی
یار اندھیر کیوں کر گیا تارہ؟

یار بتاؤ ٹھور ٹھکانہ؟
یار کسی نے دیکھا تارہ؟

ٹیس جگر سے اُٹھتی جائے
ہم نے لاکھ بھلایا تارہ

اُس کو جا کر لے ہی آتے
مول کہیں جو ملتا تارہ

کالی شب میں چھوڑ چلا جو
وہ تھا بابر آنکھ کا تارہ

احمد سجاد بابر

غزل

وگرنہ کھلتی تھیں رمزیں کہاں اداسی کی
ہر ایک نقش بنا ہے زباں اداسی کی

اسی لیے ہے درختوں پہ کپکپی طاری
پرندے بول رہے ہیں زباں اداسی کی

یہ شہرِ جاں ہے میاں پوچھتے ہو کیا ہم سے
ہوائیں چلتی ہیں اکثر یہاں اداسی کی

یہ کون ریت کے ذروں میں ریت ہونے لگا
یہ کس نے دشت میں دی ہے اذاں اداسی کی

جلائے رکھتی ہے ہر پل چراغ آنکھوں میں
عجیب موج ہے دل میں رواں اداسی کی

جہاں پہ لفظ کے سکے سخن میں ڈھلتے ہوں
ضرور ہوتی ہیں پریاں وہاں اداسی کی

یہ رتجگے یہ خلش اور خامشی کے ہجوم
ہمارے ساتھ تو ہے کہکشاں اداسی کی

عرفان صادق

غزل

یہ نظمِ کائنات کسی کے اثر میں ہے
کس کس نے جو کیا ہے، وہ اُس کی نظر میں ہے

چڑیا نے پر سمیٹ کے بچے چھپا لیے
اِک سانپ کا قیام جو بوڑھے شجر میں ہے

دینا پڑے گا تجھ کو مرے قتل کا حساب
میرے لہو کی دھار مسلسل سفر میں ہے

پُورے دروغ گو ہیں تو یلے خبر رساں
آدھا بھی سچ کہاں، کسی تازہ خبر میں ہے

جس سے رگوں میں خوں کی روانی ہے منجمد
وہ تخمِ رو سیاہ تمہارے جگر میں ہے

دن کی تھکن میں ذات کا ہوگا نہ انکشاف
یہ ایک لطفِ خاص تو پچھلے پہر میں ہے

کیوں سب کو میں بتاؤں کہ اُبھرا ہے آفتاب
میرے بدن کی دھوپ تو ہر ایک گھر میں ہے

آفتاب خان

غزل

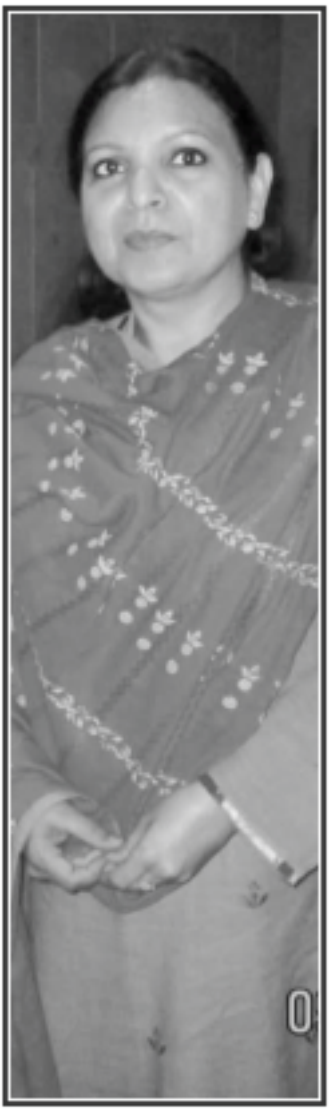

زمیں تو کیا فلک کو بھی ابھی تسخیر کرنا ہے
مجھے دیکھے ہوئے ہر خواب کو تعبیر کرنا ہے

تحرک دے کے لہروں کو کیا پہلے بپا طوفاں
اب اِس بپھرے سمندر پر مکاں تعمیر کرنا ہے

بھلا سوچیں تو کیا سوچیں، بھلا سمجھیں تو کیا سمجھیں
ہمیں تو بس بحکمِ کاتبِ تقدیر کرنا ہے

خبر میں ڈھالنا ہے اب مجھے گمنام اُلفت کو
پھر اِس کے بعد اِس کی چار سو تشہیر کرنا ہے

زمیں سنولا گئی ہے اب تو اپنے کالے کرموں سے
اِسے مثلِ مہ و انجم ہمیں تنویر کرنا ہے

نواحی بستیوں کو روند کر مٹی بنا ڈالا
انھیں بھی آپ نے کیا شاملِ جاگیر کرنا ہے

بنے گی آگے جا کر جو کبھی تاریخ کا حصہ
وہ ساری داستاں ہم کو ابھی تسطیر کرنا ہے

محبت اب نہیں کرنا، پریشاں اب نہیں رہنا
نہیں بارِ دگر ایسی کوئی تقصیر کرنا ہے

خالدہ انور

غزلیں

دیے کی لو بھی نہیں اور سراغ پا بھی نہیں
خوشا کہ شوقِ سفر میں کہیں رُکا بھی نہیں

اسی کے خوف سے لرزہ غنیم پر طاری
وہ ایک حرف جنوں جو ابھی کہا بھی نہیں

کہیں پہ چاند نہ سورج نہ کوئی تارہ ہے
یہ کیسا وقت ہے رہ میں کوئی دیا بھی نہیں

جسے نہ ہونا تھا قسمت سے بار بار ہوا
وہ جس کو ہونا تھا اب تک تو وہ ہوا بھی نہیں

راجہ عبدالقیوم

جو مل نہ پایا وہی حرفِ آرزو کیوں ہے
جو کھو گیا ہے فقط اس کی جستجو کیوں ہے

وہ کون ہوگا جو سارے ستارے دیکھے گا
نہ جانے روشنی اتنی بھی ست رو کیوں ہے؟

نہ جانے اتنا ہے کیوں مختصر یہ عہدِ حیات
نہ جانے وقت کی رو اتنی تند خو کیوں ہے؟

مجھے خبر ہے کہ تم نے یہاں نہیں آنا
تمہارے آنے کی خوش بو پہ کو بکو کیوں ہے؟

نہ جانے کتنے ستارے نظر نہیں آئے
یہ سر بسر اندھیرا ابھی چار سو کیوں ہے؟

یہ کس کے لیے ہیں یہ کس کی خاطر ہیں؟
ہجوم ماہ و نجوم اپنے سو بسو کیوں ہے؟

غزل

ہر موجِ اضطراب میں آنے کا شوق تھا
مجھ کو بھی رسم و راہ بڑھانے کا شوق تھا

تھک ہار کے کبھی تو اُسے ڈوبنا ہی تھا
کشتی جسے بھنور میں چلانے کا شوق تھا

شاید یہی سبب مری تنہائیوں کا ہے
مجھ کو ہر اک سے ملنے ملانے کا شوق تھا

رہنا پڑا کچھ اِس لیے منظر کی اَوٹ میں
رستے میں ہم کو گرد اُڑانے کا شوق تھا

ویسے ہی راکھ بن کے نہیں دربدر ہوئے
سورج کے روبرو ہمیں آنے کا شوق تھا

خوابِ وصالِ یار بھلا کیسے دیکھتے
جن کو چراغِ ہجر جلانے کا شوق تھا

مانا ظہورؔ وہ بھی بہت زُود رنج تھا
لیکن ہمیں بھی روٹھ کے جانے کا شوق تھا

ظہور چوہان

غزل

اک اداسی سی میرے گھر میں ہے
اتنی تاریکی کیوں سحر میں ہے

کچھ الگ بات اس مگر میں ہے
اسکا انکار اسکے ڈر میں ہے

حوصلہ ٹوٹ بھی تو سکتا ہے
درد ہی درد اس نظر میں ہے

وہ مجھے یاد کر کے پچھتایا
دل کسی اور کے اثر میں ہے

لوٹ جائیں گے راستے سے ہم
جانے وہ کونسے نگر میں ہے

زندگی تجھ کو ہے سکون کہیں
جسکو دیکھو وہی سفر میں ہے

نائلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کون دیوان خالد پڑھے گا یہاں
ہم نوا کیا ، کہ اب ہم زباں بھی نہیں

غزلیں

رکھتا ہے صبح و شام یوں پاگل ، ترا خیال
ہر لحظہ تیری یاد ہے ہر پل ، ترا خیال

دھڑکن کا نام دیں اسے اہلِ جہاں ، مگر
دل میں مچائے رکھتا ہے ہلچل ، ترا خیال

دنیا کی مشکلات ہیں لاکھوں ، تلاش میں
دنیا کی مشکلات کا اک حل ، ترا خیال

تنہائیوں میں حوصلہ دیتی ہے تیری یاد
ہوتا ہے تیز دھوپ میں بادل ، ترا خیال

نازک بھی ہے ، لطیف بھی اتنا ، کہ کیا کہوں
جیسے حریر ہو کہ ہو مخمل ، ترا خیال

نکہت ، گلِ شگفتہ کی رہتی ہے چاروں اور
عنبر ترا خیال ہے ، صندل ترا خیال

شوکت ، ترے خیال سے ہے فیض یاب ، آج
کس کو خبر ، رہے نہ رہے کل ، ترا خیال

شوکت محمود شوکت

پریشانی میں کٹتی جا رہی ہے
عمریا اپنی گھٹتی جا رہی ہے

جدا آپس میں بھائی ہو رہے ہیں
حویلی ، ایک بٹتی جا رہی ہے

کشش باقی نہیں ہے حسن میں کیا
نظر ، چہرے سے ہٹتی جا رہی ہے

بکھرتی جا رہی ہے بزمِ ہستی
بساطِ جاں اُلٹتی جا رہی ہے

یہاں خلقِ خدا ، اک دوسرے پر
نجانے کیوں جھپٹتی جا رہی ہے

فزوں تر ہو رہی ہے مہربانی
کہ دل سے دھول ، چھٹتی جا رہی ہے

ہماری زندگانی جانِ شوکت
مسائل سے نپٹتی جا رہی ہے

غزل

پہلے تو محسنوں کو شہیدوں میں رکھ لیا
پھر ساری عمر اپنے قصیدوں میں رکھ لیا

حسنِ عمل کے ساتھ سے محروم رہ گئی
تب آرزو کو خواب نویدوں میں رکھ لیا

وہ بھی ہے تخت و تاج کے آزار کا اسیر
اس کو بھی عہد نو کے یزیدوں میں رکھ لیا

سارے بدن میں نور کی ترسیل ہو گئی
وہ نام جب سے دل کی وریدوں میں رکھ لیا

میں ہوں فقیر میں نے بھی کشکول آنکھ کا
صحنِ حرم کے پھول چنیدوں میں رکھ لیا

تاریکیوں کی چار سو یلغار دیکھ کر
اک کوہ نور اپنی امیدوں میں رکھ لیا

یوں تلخیٔ حیات کے بدلے عذاب رنگ
حرف دعا میں تھا جو وعیدوں میں رکھ لیا

میں تو جناب عشق کی تردید کو گیا
اس نے رضاؔ مجھے بھی مریدوں میں رکھ لیا

رضا اللہ حیدر

غزل

چاندنی اک بدن کی چمکتی رہی
میرے ماتھے پہ بندیا دمکتی رہی

ایک دریا ندی کے کنارے بہا
اِک گھٹا بادلوں میں بھٹکتی رہی

ایک قربت کا آتا رہا یوں خیال
ایک شب جسم و جاں میں مہکتی رہی

جب دِیا میں نے طاقِ وفا میں رکھا
پھر ہوا میرے ہاتھوں کو تکتی رہی

تیری غفلت سرائے میں اے جانِ جاں!
میرے بالوں کی چاندی چمکتی رہی

جن کو افروز ! بیٹے کا ارمان تھا
اُن کی آنکھوں میں بیٹی کھٹکتی رہی

افروز رضوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہنستے ہنستے میں نے کہہ دی اپنی کہانی آج
تنہائی میں کب تک خالد کوئی بہائے نیر

غزل

ہم خاک بسر، خاک نشیں رہ میں پڑے ہیں
اب خواب ہمارے بھی یہیں رہ میں پڑے ہیں

امکانِ مسلسل سے جڑی کاوشِ پیہم
ہم لوگ بصد عجز کہیں رہ میں پڑے ہیں

ہم جیسے فلک پیما ہواؤں کے سفر میں
بے آسرا، ہم راہِ زمیں رہ میں پڑے ہیں

تُو کیا ہے کہ وہ تیری طرف غور سے دیکھے
تجھ جیسے جواں اور حسیں رہ میں پڑے ہیں

افتاد پڑی ایسی محبت کے نگر میں
خالی ہیں مکاں اور مکیں رہ میں پڑے ہیں

جو سنگِ حقائق کو نہ خاطر میں تھے لاتے
وہ خواب گر و خواب گزیں رہ میں پڑے ہیں

جڑتے ہیں خزف ریزے کہیں تاجِ شہی میں
یاقوت و زمرد سے نگیں رہ میں پڑے ہیں

جو قامتِ زیبا میں سر افراز تھے اصغر
وہ تیرے کفِ پا کے قریں رہ میں پڑے ہیں

اصغر علی بلوچ

غزلیں

مرے خلوص سے شب بھر مری دُعا سے رہے
چراغ برسرِ پیکار جو ہَوا سے رہے
وہ لوگ جن کو یہ عشقِ بُتاں نہ راس آیا
ہمیشہ دُور وہی آدمی خُدا سے رہے
بس ایک اِس کے سِوا کوئی بھی نہ کام آیا
جہاں میں سُرخرو ہم عشق کی عطا سے رہے
تمام عمر گزاری ہے رونے دھونے میں
کہ دُور محفلِ رنگین و خوش نما سے رہے
نہ ہاتھ کھینچ سکے ہم کبھی محبت سے
ہر ایک عہد میں ہم منسلک وفا سے رہے
وہی ہیں مالک و مختارِ کوثر و تسنیم
اُنھی کے دشت میں پیاسے مگر نوا سے رہے
بنی نہ جن کے لیے اپنی اِس زمانے سے
ہمیشہ ہم سے بہرطور وہ خفا سے رہے
کوئی بھی زخم کبھی اپنا مندمل نہ ہوا
ہمارے پاس فقط آپ کے دِلاسے رہے
تمام عمر جہانِ ستم گراں میں نبیل
رہے جو خوش تو ترے غم زدہ، ادا سے رہے

نبیل احمد نبیل

جیسے زنجیروں سے زندان بھرا رہتا ہے
دل ترے درد سے ہر آن بھرا رہتا ہے
ہم جہاں بیٹھ کے کرتے تھے دلوں کی باتیں
اب بھی آوازوں سے دالان بھرا رہتا ہے
آنکھ کھولی ہے یہ آیا ہے جہاں میں جب سے
اِک عجب خوف سے انسان بھرا رہتا ہے
صورتِ خواب ترا لوٹ کے آنا ہے نبیل
پھر بھی دل میں ترا امکان بھرا رہتا ہے
اب بھی کھلتے ہیں سرِ شاخ وہاں غنچہ و گُل ؟
اب بھی پھولوں سے گلستان بھرا رہتا ہے؟
اب جگہ کوئی نہیں باقی بزرگوں کے لیے
گھر میں اولاد کا سامان بھرا رہتا ہے
اُس کی فرقت میں سنبھلتی نہیں دھڑکن کوئی
ہر طرف سینے میں ہیجان بھرا رہتا ہے
اِس طرح دل پہ تری یاد کی یلغاریں ہیں
جس طرح جنگ کا میدان بھرا رہتا ہے
کوئی یوسف نہ کوئی یوسفِ ثانی ہے نبیل
اب بھی گر کوچہ کنعان بھرا رہتا ہے

غزلیں

فطرت کی آغوش میں پلتے، جھیل کا ہم سناٹا ہوتے
یا صحراؤں میں بل کھاتا، آس بھرا اک دریا ہوتے

ضبط کی آنچ پہ جلتے بجھتے، جیون کا ہر پل بیتا
تھوڑا جیتے، کھل کر جیتے کاش کہ ہم شعلہ ہوتے

اپنے اپنے نام تو ہوتے اک دوجے سے وابستہ
چھپ چھپ گھلنے سے تو بہتر تھا جاناں رسوا ہوتے

ذات کی کتنی تہیں ڈبولیں اندر کے سیلابوں میں
ایک تمنا تھی خود پر بھی ہم آخر افشا ہوتے

صحراؤں کی پہنائی میں نہیں تھے بادل اور برساتیں
جاذب خشک کبھی نہ ہوتا کاش ہم ایسا چشمہ ہوتے

اکرم جاذب

شمع کی طرح جلانے کے لیے ہوتے ہیں
خواب تو راہ دکھانے کے لیے ہوتے ہیں

پیاس اک حد سے گزرتی ہے تو مٹ جاتی ہے
جام آنکھوں سے لگانے کے لیے ہوتے ہیں

اہتمام آپ کی خاطر تو الگ ہوتا ہے
پھول دنیا کو دکھانے کے لیے ہوتے ہیں

فائدوں اور خساروں کی محبت والے
سارے کردار زمانے کے لیے ہوتے ہیں

کھول دیتے ہیں کبھی اشک کبھی شعر مرے
راز ایسے جو چھپانے کے لیے ہوتے ہیں

بانٹ سکتے ہیں مہک ان کی جہاں میں جاذب
زخم کچھ پھول بنانے کے لیے ہوتے ہیں

غزل

ٹکڑوں میں بٹ جاؤں
گر پیچھے ہٹ جاؤں

تیرے ساتھ ہوں پورا
دور ہٹوں گھٹ جاؤں

اتنا ضدی ہوں میں
جھوٹ کہوں ڈٹ جاؤں

ہوتے ہوئے محفل میں
محفل سے کٹ جاؤں

دھول تری یادوں کی
سر تا پا اَٹ جاؤں

خودکش جیکٹ پہنوں
تجھ سے ملوں پھٹ جاؤں

کیفی قلندر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر رنج تری عطا تھا خالد
ہر دکھ اک در بے بہا تھا

غزل

محمد اشرف کمال

وہ جتنی دیر میں اپنی کمان کھینچے گا
تڑپتے جسم کے اندر سے جان کھینچے گا

میں تم سے دور کسی دن چلا بھی جاؤں اگر
مجھے تمھاری طرف میرا دھیان کھینچے گا

مرے حروف گواہی ہیں میرے ہونے کی
زمانہ میری کہاں تک زبان کھینچے گا

مرے پروں کو کسی دن جو اس نے کھول دیا
مجھے پھر اپنی طرف آسمان کھینچے گا

اگر میں اس کے بجائے کسی کو دیکھتا ہوں
مجھے یہ ڈر ہے کہ وہ میرے کان کھینچے گا

مثالِ خوشبو وہ جائے گا آسماں کی طرف
مجھے بھی اپنی طرف خاکدان کھینچے گا

میں پانیوں کی تہوں پر رکھوں گا کشتی کو
ہوا کے زور کو پھر بادبان کھینچے گا

غزل

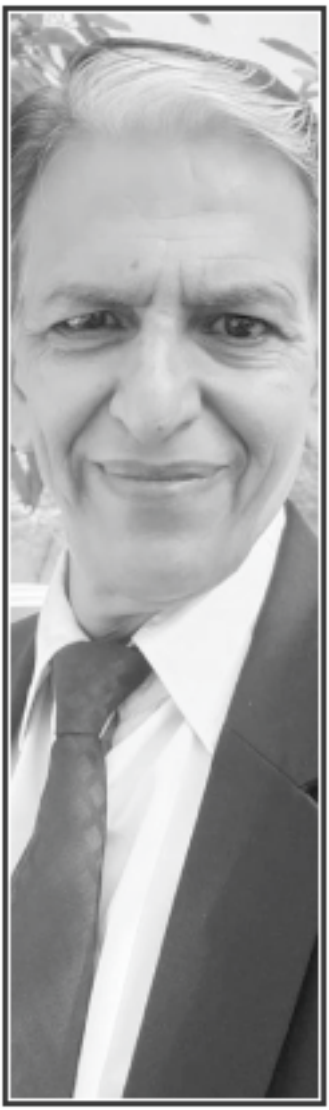

جس وقت ہم نے گلیوں سے لاشے اٹھائے ہیں
اُس وقت کتنے خون کے آنسو بہائے ہیں

منصف سزا کہاں کوئی اس کو سنائے گا
جس نے غریبِ شہر کے سپنے چرائے ہیں

دیکھا عجیب شہر کے حاکم کا مشغلہ
انسان قتل کر کے کبوتر اڑائے ہیں

ظالم ہوا سے اب یہ ضروری ہے پوچھنا
کیوں راہ کے دیئے سبھی اُس نے بجھائے ہیں

لگتی ہے ایک دن تجھے اس ماں کی بد دعا
بھوکی رہی جو بچے بھی بھوکے سلائے ہیں

دیتے رہے جو تم ہمیں پل پل اذیتیں
کتنی ہی مشکلوں سے وہ لمحے بھلائے ہیں

بچے یہ قرض لوگو اتاریں کے کس طرح
اولاد کے جو ماؤں نے نخرے اٹھائے ہیں

عابد کہو انہیں کبھی دیکھیں اتار کر
آنکھوں پہ جو اناؤں کے چشمے لگائے ہیں

عابد معروف مغل

غزلیں

غمِ شام و سحر نے مار دیا
مجھ کو میری خبر نے مار دیا

شبِ غم میں تھا اور تری یادیں
کیوں طلوعِ سحر نے مار دیا

اشک تو خیر رُک بھی سکتے تھے
سیلِ خونِ جگر نے مار دیا

میں ہوں روشن مریضِ غم وہ جسے
چارۂ چارہ گر نے مار دیا

ذوقِ قلب و نظر کو کیا کہیے
شرمِ قلب و نظر نے مار دیا

مجھ اسیرِ قفس کی بات نہ پوچھ
جُنبشِ بال و پر نے مار دیا

اعجاز روشن

عزت کو چھوڑ اب یہاں شہرت بٹور لے
رہنا ہے سب کے بیچ تو دولت بٹور لے

آ ہی گئے بہشت میں تو دیکھتا ہے کیا
توہینِ ہست و بود کی اجرت بٹور لے

تم تھک گئے ہو علم کی صحبت میں اے میاں
جا کر مشاعرے میں فراغت بٹور لے

ہیں اپنے اپنے راستے اپنی ضرورتیں
نفرت ، بٹور لے کہ محبت بٹور لے

کمزوریوں کی داد نہ قانون سے تُو مانگ
دہشت گردوں سے اپنی حمایت بٹور لے

غزل

تیرے جمال کی زد میں ہوں
میں اپنی ذات کے رد میں ہوں

دشتِ امکاں رہ گیا پیچھے
میں تیرے خیال کی حد میں ہوں

تری گفتگو میں تو ذکر نہیں
ترے لہجے کے شد و مد میں ہوں

یہاں چھاؤں میرا نصیب نہیں
یہاں سب سے بڑا میں قد میں ہوں

میں راہِ جنوں میں حبیب ابھی
سرِ منزلِ خال و خد میں ہوں

بشیر احمد حبیب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دم سادھ کے دیکھوں تجھے، جھپکوں نہ پلک بھی
آنکھوں میں سمولوں، ترے لہجے کی دمک بھی

غزل

لگیں گے اس کو پر، لگنے لگا ہے
بڑھے گا اب کے شر، لگنے لگا ہے

جسے پانا کبھی ممکن نہیں تھا
اسے کھونے کا ڈر لگنے لگا ہے

زمانہ جانتا ہے جس کو دشمن
مجھے کیوں چارہ گر لگنے لگا ہے

گھڑی بھر کو جو تیرے پاس بیٹھا
وہ سب کو معتبر لگنے لگا ہے

ہماری محفلوں کا کیا بنے گا
اناؤں پر ثمر لگنے لگا ہے

خبر پل پل کی جو رکھتا تھا میری
وہ مجھ سے بے خبر لگنے لگا ہے

ملا ہے جب سے اس کا ساتھ عاجز
حسیں ہر اک سفر لگنے لگا ہے

نوید عاجز

غزل

دیکھا بھالا ، دکھائی دیتا ہے
ظرف والا ، دکھائی دیتا ہے

اب تو جس کو بھی دیکھتا ہوں میں
ساٹھ سالہ ، دکھائی دیتا ہے

بولے تو کوئی کس طرح بولے
لب پہ تالا ، دکھائی دیتا ہے

اس کو منظور ہو ، حفاظت تو
سب کو جالا ، دکھائی دیتا ہے

ایسی بحثوں میں وہ نہیں پڑتا
کتنا بالا ، دکھائی دیتا ہے

جسم گورا سہی مگر عاصم
مَن کا کالا ، دکھائی دیتا ہے

عاصم بخاری

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رکھتا ہے یہاں کون خبر عیب و ہنر کی
خالد ہمیں کس نے نظر انداز کیا ہے

غزل

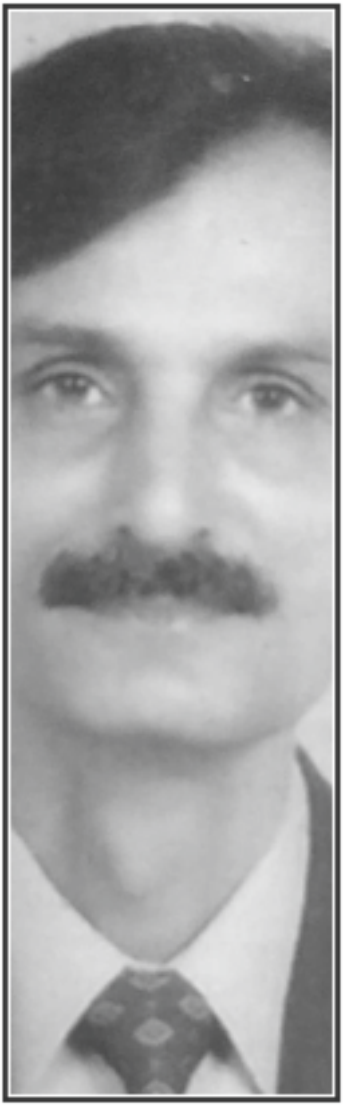

مجھ پہ واجب تھا نصابوں کی طرح
اس کو پڑھتا تھا کتابوں کی طرح

میں بھی شامل تھا تری راتوں میں
موتیے اور گلابوں کی طرح

دیکھ کر اس کو ہوئی تھی حیرت
ہو بہو میرے ہی خوابوں کی طرح

ٹوٹ جاتے تو بھلا بھی دیتا
خواب نکلے ہیں سرابوں کی طرح

دیکھ لیتا ہوں مگر چھپ چھپ کر
میں تجھے تیرے حجابوں کی طرح

دوستی اس سے نہیں ہو سکتی
وہ نہیں خانہ خرابوں کی طرح

میں امام ایسے نہیں پی سکتا
دکھ کے آنسو کو شرابوں کی طرح

مظہر امام

غزل

اذیت گھوم پھر کے پھر ہمارے پاس آتی ہے
سہولت تو تصور آپ کو ہی راس آتی ہے

نہیں معلوم غم نے اُس طرف ڈیرا لگایا کیوں
گزر کر اُس گلی سے تو خوشی بے آس آتی ہے

بُجھا تو لیں کنویں پر جا کے اپنی پیاس ہم اک دن
سُنا ہے پیاس خود چل کر ہمارے پاس آتی ہے

حسیں یادیں اکیلا پن اُداسی اور درد و غم
دُکھی دل کو بہر صورت فضا یہ راس آتی ہے

ہماری بھی پرانی اُس سے وابستہ ہیں کچھ یادیں
تصور جو اٹک سے اک سڑک "اخلاص" آتی ہے

تصور اقبال

انتخاب

— خالد احمد —

جذبوں کے بادل لائیں گی یا رُوح یخ کر جائیں گی
کیا جانے کس سمت سے کیسی ہوائیں آئیں گی

نعمان منظور

غزل

دل ہے بہشت ایسا نگیں چاہیے مجھے
اک دلنشین شخص مکیں چاہیے مجھے

اے ربِ کائنات میں دنیا کا کیا کروں
جب وہ نہیں تو کچھ بھی نہیں چاہیے مجھے

بس ایک شخص مانگ رہا ہوں مرے خدا
بس آج ہی ابھی وہ یہیں چاہیے مجھے

کتبے پہ میرے نام کا جلتا ہوا چراغ
مالک زمیں پہ اتنی زمیں چاہیے مجھے

شکوہ خلافِ عشق ہے یہ مانتا ہوں میں
لیکن وصال اس سے کہیں چاہیے مجھے

اتنا کرم تو ہو کہ اسے بڑھ کے چھو سکوں
وہ خواب خواب ہی میں نہیں چاہیے مجھے

خالد ندیم شانی

غزل

آنسو دیکھا ہے کئی بار ستارا کر کے
نفع اس کام میں ہوتا ہے خسارا کر کے

اس کے بارے میں کسی اور سے پوچھو جا کر
ہم نے دیکھا ہی نہیں پیار دوبارہ کر کے

روز و شب میرے گذرتے ہیں اسے ڈھونڈنے میں
کوئی چھپ جاتا ہے اک بار اشارا کر کے

ہم فقط دیپ جلاتے ہیں لحد پر جا کر
چھین لیتا ہے خدا سب کو ہمارا کر کے

حال گر پوچھنا ہو تو مرا خود سے پوچھو
خود کو میں بھول گیا کب کا تمہارا کر کے

اس کا انجام خدا جانے کہ کیا ہو شوکت
خواب کو بیٹھ گیا میں تو سہارا کر کے

افتخار شوکت

غزل

زندگی سب کو کہاں اپنے قریں رکھتی ہے
جس کو رکھنا ہو جہاں اُس کو وہیں رکھتی ہے

اب بھی تازہ ہے کسی دل میں محبت میری
آج بھی وہ مری تصویر وہیں رکھتی ہے

رونے لگتے ہیں مرا ضبط پرکھنے والے
غم کی دیوی مرے قدموں پہ جبیں رکھتی ہے

میری تنہائی بڑھاتی ہے مری وحشت کو
میری وحشت ہی مجھے گوشہ نشیں رکھتی ہے

عشق نے ہوش محبت کے اڑا ڈالے ہیں
رکھنا ہوتا کہیں پاؤں کہیں رکھتی ہے

جھوٹ بھی اُس کو مرا سچ ہی نظر آتا ہے
مجھ سے بڑھ کر مری باتوں پہ یقیں رکھتی ہے

میری امید بکھرنے نہیں دیتی مجھ کو
اک دعا روز سرِ عرشِ بریں رکھتی ہے

پہلے لیتی ہے کڑی مجھ سے مشقت دنیا
پھر ہتھیلی پہ مری نانِ جویں رکھتی ہے

اظہر کمال

غزل

پہلے تو پر سکوں ہونے کا حوالہ دینا
پھر مجھ میں اک جنوں ہونے کا حوالہ دینا

ممکن ہے جِلد بے وقعت جان کر نہ آئے
تم زخم اندروں ہونے کا حوالہ دینا

ملحد نہ سن سکیں تم اس احتیاط کے ساتھ
درویش پر فسوں ہونے کا حوالہ دینا

ان سے شکستگی مَس کر کے پرندو اپنی
پیڑوں کے تن میں خوں ہونے کا حوالہ دینا

یک جہتیوں میں میری فاقہ کشی سے پہلے
پرچم کے سرنگوں ہونے کا حوالہ دینا

انمول کی کمی میں، کتنا عجیب ہے ناں؟
ممنوع کے زبوں ہونے کا حوالہ دینا

ساگر پھلانگ کر جانے والوں کو عبث ہے
دیوار، بے ستوں ہونے کا حوالہ دینا

ساگر حضور پوری

غزل

غم تو اقساط کی صورت میں اُبھارے ہیں ابھی
اس کہانی کے کئی اور شمارے ہیں ابھی

آنکھیں یکلخت سیہ زلفوں میں روپوش ہوئیں
کیونکہ پلکوں پہ تو کچھ اور ستارے ہیں ابھی

سب کے ہوتے ہوئے کس درجہ اکیلی ہوں میں
ویسے موجود تعلق میں تو سارے ہیں ابھی

برف وحشت کی پگھلنے کی نہیں ہے شاید
جھیل کی گود میں خاموش شکارے ہیں ابھی

زندگانی سے ملی خوشیوں کو رکھا ہی نہیں
جتنے غم اس سے ملے ہیں وہ ہمارے ہیں ابھی

میٹھے قطروں کو ترستی ہوں ثمینہ سید
میری پلکوں پہ جو موتی ہیں وہ کھارے ہیں ابھی

ثمینہ سیّد

غزلیں

اپنی طرف سے ہم نے سنوارے ہیں سب کے سب
تقدیر نے ہی کام بگاڑے ہیں سب کے سب

اے کاش صبح آئے تو ان کو سمیٹ لے
مژگاں پہ آنسوؤں کے جو تارے ہیں سب کے سب

کاٹی ہیں ہم نے راتیں بھی تنہا اسی طرح
تیرے بغیر دن بھی گزارے ہیں سب کے سب

جس کی تلاش ہے مجھے ملتا نہیں کہیں
چہرے تو میرے چار سو پیارے ہیں سب کے سب

وسیم جبران

مجھ میں تو سب شورشیں ہیں ذہن کی
باغیانہ سازشیں ہیں ذہن کی

ٹھوکروں کی زد میں دل کیوں آگیا
جبکہ ساری لغزشیں ہیں ذہن کی

خوشبوؤں کو ہاتھ سے میں چھو سکوں
یہ عجب سی خواہشیں ہیں ذہن کی

کیوں بھٹکتے ہیں ہم اپنے شہر میں
پاؤں میں یہ گردشیں ہیں ذہن کی

ہم نے غموں کو ہنس کے گلے سے لگا لیا
جتنے تھے درد دل میں اُتارے ہیں سب کے سب

آنکھیں ہیں نیم باز تو عارض بھی سرخ ہیں
چاہت کے اجنبی میں اشارے ہیں سب کے سب

یادیں ہوں تیری، خواب یا تیرا خیال ہو
جبران جینے کے یہ سہارے ہیں سب کے سب

شاعری ہے یا کرشمہ سازیاں
کچھ بھی ہو یہ کاوشیں ہیں ذہن کی

سوچ میں جبران روتا ہے کوئی
آنکھ میں سب بارشیں ہیں ذہن کی

غزل

آنکھ میں خواب ، دل میں غم رکھا
ہم نے زادِ سفر کو کم رکھا

اس علاقے سے اب علاقہ نہیں
خِطۂ دل میں پھر بھی ضم رکھا

خود کو ہونے نہیں دیا مغلوب
ہم نے دشمن کا بھی بھرم رکھا

سامنے آئے وہ نشیلے نین
ہاتھ سے ہم نے جام جم رکھا

ہم بہر طور مسکرائے مگر
دل کی آنکھوں نے خود کو نم رکھا

اس نے باندھا بہت مگر ہم نے
ہلکا پھلکا سا پھر بھی رم رکھا

آنکھ نے راستا کیا ہموار
دل نے ہولے سے پھر قدم رکھا

کون مجھ میں رہا مقیم سدا
کس نے آباد یہ حرم رکھا

وار کیا کیا نہیں ہوئے نازش
پھر بھی ہم نے سخن بہم رکھا

شبیر نازش

غزل

گلشنِ دل پر بہارِ جاوداں تحریر ہے
پتے پتے پر ہماری داستاں تحریر ہے

کاش ان سے پوچھتے تم ان کی بربادی کا حال
جن کے ہونٹوں پر فقط آہ وفغاں تحریر ہے

رشک کرتا ہے فلک بھی دیکھ کر یہ عزوشان
میری دھرتی پر بہارِ جاوداں تحریر ہے

لوگ دلچسپی سے پڑھتے ہیں بیاضِ دل مری
اس کے ہر مصرعے میں عزم بے کراں تحریر ہے

اس کے سائے میں گزرتی ہے مری عمرِ رواں
بخت میں جو کچھ مرے سود وزیاں تحریر ہے

میرے ہاتھوں کی لکیریں غور سے دیکھو ذرا
میری چاہت کی جہاں اک داستاں تحریر ہے

دوستی تیری بھلا دینا مرے بس میں کہاں
آج بھی دانش کے دل پر جانِ جاں تحریر ہے

اعجاز دانش

غزل

میں جو بولوں تو میرے ساتھ جہاں بولتا ہے
اب یہ شکوہ کہ میرا دشمن جاں بولتا ہے

آگ یہ کس نے لگائی ہے میرے خرمن کو
راکھ تو چپ ہے مگر اس کا دھواں بولتا ہے

عشق میں پایا ہے کیا اور ہے کیا کچھ کھویا
یاد کچھ بھی نہیں احساس زیاں بولتا ہے

گھر کی رونق تو فقط اس کے مکین ہوتے ہیں
رہیں مکیں نہ تو پھر خالی مکاں بولتا ہے

سمجھنے والے سمجھ لیتے ہیں تیور اس کے
وقت گونگا ہے اشاروں کی زباں بولتا ہے

جانے ہر چھوٹے کو کیوں لوگ سمجھتے ہیں حقیر
ورنہ اک ذرے میں بھی پورا جہاں بولتا ہے

آپ کا حکم تھا تا عمر زباں بندی کا
اذن گویائی ملے بھی تو کہاں بولتا ہے

کنج مقتل میں تو سناٹا ہے طاری اشفاق
کس کا خون ہے جو سرنوک سناں بولتا ہے

محمد اشفاق بیگ

غزلیں

مرے سوز کا بھی خیال کر نہ ملال کر
یوں نہ روز آنکھوں کو لال کر نہ ملال کر

مری پَند تجھ کو نہیں پسند تو ٹھیک ہے
تو ہے خوش اگر مجھے ٹال کر نہ ملال کر

یہ سیہ اساس نصیب ہے کہ چراغ ہوں
میں تو خوش ہوں دنیا اُجال کر نہ ملال کر

سبھی چُپ ہیں اپنے مقدروں کے جواب میں
تُو بھی رب سے اپنا سوال کر نہ ملال کر

یہ نمودِ قصۂ رفت ہے مرے ذوق رنج
کوئی خاص نکتہ نکال کر نہ ملال کر

کہیں پھینک آ، یہ ضعیف لمحوں کی گٹھڑیاں
سبھی درد رکھ دے اُچھال کر نہ ملال کر

کبھی جُرعہ جُرعہ پیا تھا جو سمِ صندلیں
کسی گیت میں اُسے ڈھال کر نہ ملال کر

او مرے خدا! وہ بھی صرف رسمی سی بات تھی
جو کہا تھا اُس نے، خیال کر نہ ملال کر

صائمہ اسحاق

خوف مجسم آہٹ میں تبدیل ہوا
غصہ تب گھبراہٹ میں تبدیل ہوا

روشن روشن آنکھوں میں سپنے اترے
کترانا شرماہٹ میں تبدیل ہوا

شوخی اور شرارت کے معنی بدلے
ناز بھی پھر تریاہٹ میں تبدیل ہوا

چوری پکڑی جانے سے پہلے کا بیاں
اک بودی ہکلاہٹ میں تبدیل ہوا

شوق کا موسم رنگ بدل کر پہلے تو
عادت پھر اکتاہٹ میں تبدیل ہوا

ترش روی کا جھکڑ اس کے لب چھو کر
میٹھی سی نرماہٹ میں تبدیل ہوا

دھیرے دھیرے جذبوں کے چھلکے اترے
مسکانا غراہٹ میں تبدیل ہوا

ننھے ننھے شکوؤں کو الفاظ ملے
رونا جب تلاہٹ میں تبدیل ہوا

جنم لگا پورا تو تنہائی کا ساتھ
اب جا کر دوسراہٹ میں تبدیل ہوا

غزل

مصروف تماشائی! ہر آئنہ اک تھل ہے
جو عشق مکمل ہے وہ آنکھ سے اوجھل ہے

ہارے ہیں وہاں دل ہم جس شہرِ نگاراں میں
دستورِ محبت کا پیرایہ ہی گنجل ہے

رنگین ہوا پانی اک نیلگوں رنگت میں
بہتے ہوئے دریا پر پھیلا کوئی آنچل ہے

ناگاہ کہیں ہونا یا گاہے نہیں ہونا
خوشبو ہے کہ نرگس ہے بجلی ہے کہ بادل ہے

عادل کئی برسوں سے ماتم کدۂ دل میں
ہر عکس مخوّف ہے ہر آئنہ بوجھل ہے

عزیز عادل

غزل

وہ کوئی لمحہ مسکراتی ہے
سوچ کس درجہ بے ثباتی ہے

اس لیے بھی میں سونا چاہتا ہوں
میرے خوابوں میں ریل آتی ہے

میں کوئی قتل ہی نہ کر بیٹھوں
جس قدر مجھ کو جیل بھاتی ہے

ہائے وہ وقت جب ملیں گے نہیں
سوچتا ہوں تو جان جاتی ہے

میں بہت جلد مارا جاؤں گا
میرے ہمراہ میرا گھاتی ہے

اور تو اس سے کیا تعلق ہے
اک ملاقات حادثاتی ہے

میں کسی روز جا کے دیکھوں گا
موت کیوں اپنے ہاں بلاتی ہے

چاہتا ہوں کبھی نہ دکھ دیکھے
وہ جو ہر وقت مسکراتی ہے

میں اسے بھول کر بھی دیکھوں گا
جو مجھے روز یاد آتی ہے

یار وہ اتنی خوبصورت ہے
ایسا لگتا ہے پھول کھاتی ہے

پھول کا پھر بکھرنا بنتا ہے
وہ اگر پتیاں اٹھاتی ہے

وقت اور جگہ کا تو علم نہیں
وہ مگر مجھ سے ملنے آتی ہے

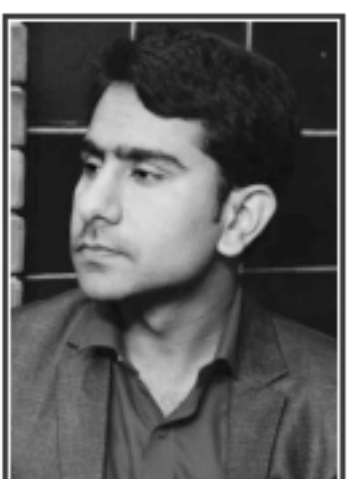

امتیاز انجم

غزلیں

چاند تاروں کے یہ نزدیک نہیں ہوتی تھی
رات پھر بھی مری تاریک نہیں ہوتی تھی

آدھے تو مانتے تھے مجھ کو مسیحا اپنا
اور آدھوں کو یہ توفیق نہیں ہوتی تھی

کیسے منزل پہ پہنچتا مرے سالار بتا
جن دنوں سمت مری ٹھیک نہیں ہوتی تھی

ایسا بھی وقت ہوا کرتا تھا پہلے پہلے
مانگی جاتی تھی مدد بھیک نہیں ہوتی تھی

کامیابی کے لیے لوگ دعا کرتے تھے
کوئی جلسہ کوئی تحریک نہیں ہوتی تھی

اسد رضا سحر

آستانے کی بات کرتے ہیں
پھر زمانے کی بات کرتے ہیں

تیر پر تبصرہ نہیں کرتے
ہم نشانے کی بات کرتے ہیں

آنکھ والے بھی گھر نہیں پہنچے
آپ کانے کی بات کرتے ہیں

مدتوں بعد تیرے گریہ گزار
مسکرانے کی بات کرتے ہیں

مجھکو نوحہ ملا ہے گھٹی میں
لوگ گانے کی بات کرتے ہیں

تیرے جانے پہ لوگ آپس میں
تیرے آنے کی بات کرتے ہیں

غزل

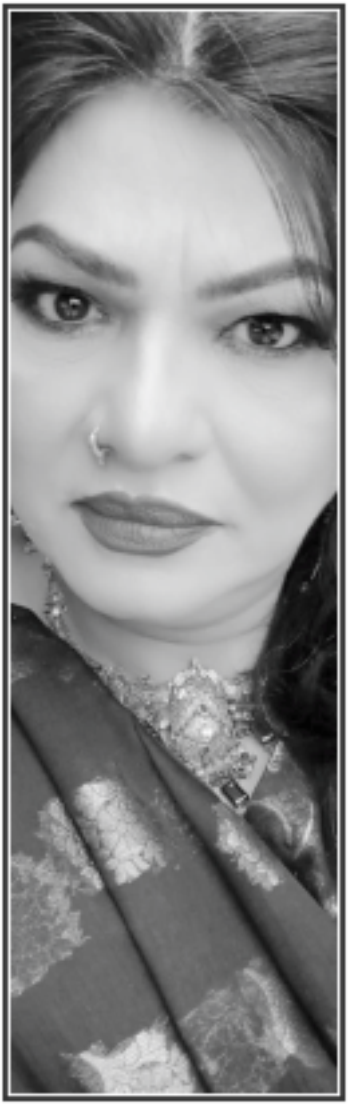

ظلم برباد ہونا چاہیے تھا
بشر آزاد ہونا چاہیے تھا

سرخرو سامنے محبت کے
دلِ ناشاد ہونا چاہیے تھا

چاند کے مرتبے پہ دنیا میں
یہ زمیں زاد ہونا چاہیے تھا

وہ غزل کے حصار میں پابند
نظمِ آزاد ہونا چاہیے تھا

منصبِ شاہی پر ہے آ بیٹھا
جسے جلاد ہونا چاہیے تھا

اس غلامی میں جینے والوں کو
موت پر شاد ہونا چاہیے تھا

میری عزت کا پاسبان جیا
میرا ہمزاد ہونا چاہیے تھا

جیا قریشی

غزل

کس طرح کا خواب ہے، تعبیر ہے
میرا دکھ میرے لئے اکسیر ہے ؟

یہ ہُنر ہے یا کوئی زنجیر ہے
سب سے مشکل ذات کی تعمیر ہے

کس طرح منزل تک پہنچے بھلا
بے طلب بے فیض ہے، بے پیر ہے

کوئی حد کوئی بھی پیمانہ نہیں
شاعری اور عشق عالمگیر ہے

اس لیے تضمین کرتے ہیں تجھے
تُو ہمارے ذوق کی جاگیر ہے

آگے آگے خواہشوں کی ریل پیل
پیچھے پیچھے کاتبِ تقدیر ہے

میں یونہی خاموش ہو سکتا نہ تھا
میرا چہرہ کرب کی تفسیر ہے

مستحسن جامی

غزلیں

نہ رہا وہ گلِ دوپہری بھی
نہ اس آواز کی مسہری بھی

ہو گئی بازیاب تنہائی
لگ گئی درد کی کچہری بھی

سانپ شہوانی خواہشوں کے امیں
دو غلے پیڑ بھی گلہری بھی

شامچے دیر سے ہوئے خالی
دھوپ لحظہ دو لحظہ ٹھہری بھی

آگ زرپوش چولیوں میں لگی
راکھ جھڑتی رہی سنہری بھی

پیڑ بدھیتی میں یکتا تھا
شاخ پر آم تھے دسہری بھی

اب کلہاڑی سے تعزیت کیجے
کٹ گئی پیڑ میں گلہری بھی

عقیل عباس

لوگ جب بددعائے جاتے ہیں
اپنے اندر اٹھائے جاتے ہیں

ہے زمانہ وہ اصطبل جس میں
خفیہ رستوں سے لائے جاتے ہیں

چند کتے ہیں چھینا جھپٹی میں
دل کی دھجی اڑائے جاتے ہیں

ہے فصیلِ حیاتِ نو میں شگاف
لوگ آتے ہیں آئے جاتے ہیں

آسمانی ضیافتوں کے لیے
خاک برسر بلائے جاتے ہیں

لعل ماؤں کے باندھ کر مشکیں
گھوڑیوں پر لدائے جاتے ہیں

فاختاؤں بیاہتاؤں کے
کون بچے اٹھائے جاتے ہیں

نیند کا عرس ہے نگاہوں میں
خواب لنگر لگائے جاتے ہیں

کوزہ گر سے کوئی شکایت ہے
آپ کیوں منہ بنائے جاتے ہیں

ایسے کورے کٹورے نینوں کے
کن لبوں سے لگائے جاتے ہیں

پیڑ خود تو کہیں نہیں جاتے
دور تک ان کے سائے جاتے ہیں

غزل

شرابِ سرخ پی اور پا پیادہ اک سفر کاٹا
خمار و خستگی میں ہم نے رستہ بے خبر کاٹا

جُنوں کے کان کاٹے اک ولندیزی مصور نے
پھر اپنے موقلم سے بے خطر وحشت کا سر کاٹا

زمیں کے دوسری جانب وہی خورشید روشن تھا
وہ جس کے ڈوبنے کا ہم نے صدمہ رات بھر کاٹا

خلازاروں سے پہنچا آ کے نخلستانِ رخشاں تک
سوار ایسا کہ بس اک جست میں سارا سفر کاٹا

سماعت جاں بلب تھی خامشی کے قید خانے میں
پھر اک آواز کے تیشے نے دیواروں میں در کاٹا

عدم سے عالمِ امکاں کی دوری اک قیامت تھی
مگر چوتھی جہت میں یہ سفر بھی بے خطر کاٹا

خیالِ نو کو راس آئے گی کب کوتاہ پروازی
کسی مقراضِ کہنہ نے گر اس شاہیں کا پر کاٹا

عابد رضا

غزلیں

روحِ رواں بدن کی بناوٹ سے بے نیاز
میلانِ شور و شر کی ملاوٹ سے بے نیاز

یعنی کسی یقین کے صدمے پہ اشکبار
یعنی کسی گمان کی سلوٹ سے بے نیاز

لب بستہ اک ہجوم سے گزرا ہوں آج بھی
کارِ جہانِ زیست کی آہٹ سے بے نیاز

کثرت سے مر رہے یہاں جینے کی تاب میں
کم لوگ ہیں کہ موت کے جھنجھٹ سے بے نیاز

اک آستاں ہو ایسا کہ دیوار و در نہ ہو
اک ایسی سجدہ گاہ ہو کہ چوکھٹ سے بے نیاز

اسرارِ بے نوا کی ہی تصدیق ہوں شفق
ہم راز سامنے ہے کہ گھونگھٹ سے بے نیاز

شفقت حسین شفق

کشتیاں کھول کر کناروں سے
ہو گئے دُور لوگ پیاروں سے

کیا ہوا برگ برگ پھرتا شخص
پُوچھتی ہے خزاں بہاروں سے

کِس طرف لَو اُڑان بھر کے گئی
کب کبوتر اُڑے اناروں سے

شعلۂ جسم اور برہنہ ندی
چاند اک جھیپتا ستاروں سے

سرحدِ آب بُھول جاتے ہیں
یہ مچھیرے اُلجھتے دھاروں سے

کرنی پڑتی ہے آنکھوں کو تنویر
واپسی اپنی خواب زاروں سے

تنویر قاضی

غزلیں

ہاتھ ایسا ملا چنبیلی سے
خوشبو جاتی نہیں ہتھیلی سے

چپکے چپکے کسی کے رونے کی
اب بھی آئے صدا حویلی سے

لکھی قسمت تو لکھنے والے نے
اور وہ لڑتا رہا ہتھیلی سے

افضل ہزاروی

کچھ کمی جو تکان میں آئی
جان میری امان میں آئی

طفل کھل سا گیا جو دیکھا اسے
ایک تتلی جو لان میں آئی

کون آیا ہے در پہ دیکھو تو
خوشبو سارے مکان میں آئی

چھوڑا جاتا ہے کیسے اپنوں کو
پوچھ دلہن نئی نویلی سے

تم کو افضل سمجھنا مشکل ہے
سب کو لگتے ہو تم پہیلی سے

شہر میں جب ہوئی زباں بندی
آنکھ پھر امتحان میں آئی

شیریں لہجہ تھے یار افضل تم
کیسے تلخی زبان میں آئی

غزل

یہ مہربانی ہے کس کی اور یہ کمال کس کا
مرے تصور میں آ گیا ہے جمال کس کا

ہمارے دل میں یہ ساز کیا ہے، گداز کیا ہے
یہ مور بن کر تھل رہا ہے خیال کس کا

یہ بھر دیے کس نے سادہ لفظوں میں رنگ و خوشبو
اُداس غزلوں میں مسکرایا جمال کس کا

افق کے ماتھے پہ چشم و ابرو وہ لب گلابی
وہ شب کو پیکر بنا رہا تھا ہِلال کس کا

نہیں ہوں جب سے تری نظر میں، یہ سوچتا ہوں
تری نظر میں ہوا ہے رتبہ بحال کس کا

یہاں پہ سب کو ہی اپنی اپنی پڑی ہوئی ہے
اب اس زمانے میں کون رکھے خیال کس کا

حماد ریاض

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

گھٹتے گھٹتے میں کتاب عشق میں
ایک سطر انتسابی ہو گیا

غزل

ہم درختوں کو اگر خواب سنانے لگ جائیں
ان پرندوں کے تو پھر ہوش ٹھکانے لگ جائیں

آخری پل ہے ذرا بیٹھ کہ باتیں کر لیں
عین ممکن ہے پلٹنے میں زمانے لگ جائیں

یہ بھی ممکن ہے کہ چپ چاپ سرِ بزم رہیں
یہ بھی ممکن ہے کوئی گیت سنانے لگ جائیں

ہم نوافل میں ترے نام کی تسبیح کریں
یوں بھی مسجد میں ترا ہجر منانے لگ جائیں

کوزہ گر تم سے مرے خواب نہیں ٹھیک بنے
بس یہی سوچ کے پھر چاک گھمانے لگ جائیں

حضرتِ قیس ترے خواب کی بیعت کر کے
ہم کسی دشت میں پھر نام کمانے لگ جائیں

یہ بھی ممکن ہے کہ چپ چاپ تراہجر سہیں
یہ بھی ممکن ہے کوئی حشر اٹھانے لگ جائیں

ہم ہیں تنہائی کے مارے ہوئے کمرے کے مکیں
جو بھی مل جائے اسے دوست بنانے لگ جائیں

ہم نئے دور کے عاشق بھی عجب ہیں کہ ندیم
جو بھی مل جائے اسے شعر سنانے لگ جائیں

آغر ندیم سحر

غزل

وہ جو چپ چاپ سا اور سب سے جدا بیٹھا ہے
دل کسی کارِ محبت میں لگا بیٹھا ہے

شہرِ عشرت کی فصیلوں پہ ٹھکانہ نہ ملا
دکھ کا پنچھی مری دیوار پہ آ بیٹھا ہے

تیرے اندر کوئی خوبی ہے خزانے والی
یہ تری خاک پہ اک سانپ جو آ بیٹھا ہے

جینے دے گی نہ کبھی اس کو جدائی میری
وہ تعلق میں جو دیوار اٹھا بیٹھا ہے

تجھ کو بخشا نہیں نائب کا یہ رتبہ یوں ہی
خاک زادے ترے اندر بھی خدا بیٹھا ہے

وہ جو دلشاد بلاؤں سے لڑا کرتا تھا
اپنی دھڑکن کی صدا سے ہی ڈرا بیٹھا ہے

دلشاد احمد

غزلیں

محبت کا یہ قصہ بھی ستم آثار لگتا ہے
یہ صحرا پار کیسے ہو، سفر دشوار لگتا ہے
مقامِ رائیگانی پر مجھے پہنچا دیا تو نے
کہ ہر لمحہ تری یادوں کا اب آزار لگتا ہے
یہاں تعبیر بھی ملتی ہے تو ملتی ہے دولت سے
یہاں مفلس کے خوابوں کا میاں بازار لگتا ہے
کبھی تو آسماں کو چھو کے لوٹ آنے کی خواہش تھی
مگر اب فکر میں روزی کی سب بیکار لگتا ہے
نظر کے سامنے ہے وہ، مگر کس کام کی قربت؟
کہ حالِ دل اسے کہنا بہت دشوار لگتا ہے

عبدالرؤف زین

ترا وصل اک داستاں ہے ابھی
یہ ممکن کہاں، بس گماں ہے ابھی

جو اک خواب کالج میں دیکھا گیا
وہ خوابوں کا قصہ رواں ہے ابھی

اُدھوری ہے تیرے بنا زندگی
یہی دل کا تازہ بیاں ہے ابھی

تمہیں ڈھونڈتی ہیں یہ تنہائیاں
کہ ہر سانس اک امتحاں ہے ابھی

وفا کے نام پر ہر بار میں قربانیاں کیوں دوں
کہ ہر وعدہ نیا دھوکا مجھے، سرکار لگتا ہے
کوئی اپنا نہیں جس سے کہ دل کی بات کہہ پاؤں
یہ دل تنہائی کے موسم کا اک تہوار لگتا ہے
میں آنکھوں میں سمیٹے خواب، صحرا میں کھڑا ہوں زین
یہ منظر عشق کی راہوں کا اک اظہار لگتا ہے

حسیں تم سے ہر ایک احساس تھا
ترے بن یہ خالی جہاں ہے ابھی

یہ غزلیں معطر ترے دم سے ہیں
تمھی سے یہ دل بھی جواں ہے ابھی

کسی بد گمانی کا مظہر ہے زین
فضاؤں میں یہ جو دھواں ہے ابھی

غزلیں

گرچہ تُو دل کے آس پاس ہے یار
آج کا دن بہت اُداس ہے یار

اس لیے بھی مہکتا ہوں مجھ میں
پھول کی طرح تیری باس ہے یار

جھڑ چکا ہوں میں شاخ سے کب کا
اب مجھے خاک سار راس ہے یار

جب سے اُس شوخ کا چُھوا آنچل
دامنِ دل کو راس گھاس ہے یار

تیرے عارض پہ تھے فریفتہ کل
آج بھی آخری یہ آس ہے یار

سرفراز عارض

دُور تک دشت ہے گزارا کر
زندگی ہے یہی گوارا کر

چاک پر تُو مجھے گھما پھر سے
میری تخلیق بھی دوبارا کر

آنکھ میں واہموں کا جنگل ہے
کُوچ سے پہلے استخارا کر

میں سمندر سمیٹ لاؤں گا
تُو مِرے پاس بس کنارا کر

ہجر کی آنکھ سے گِرا تھا جو
وہ ہی آنسو اُٹھا ستارا کر

زندگی تجھ پہ وار دوں گا میں
مہدی اک بار بس اشارا کر

غضنفر مہدی

غزل

راستہ تبدیل کرنے سے رہا
دل مری تعمیل کرنے سے رہا

دیکھنے کی ان کو عادت ہے تجھے
اپنی آنکھیں سیل کرنے سے رہا

ربط کے فقدان پر میں کم نما
غیب کی تمثیل کرنے سے رہا

راس آئی ہوں جسے آزادیاں
جبر کی تکمیل کرنے سے رہا

تم نے جھٹلانا ہے جھٹلا دو مگر
سچ کو میں تحلیل کرنے سے رہا

پھونک دم تعویذ دے مرشد کہ میں
دائرے کو کیل کرنے سے رہا

پڑھ مرا چہرہ کہ تجھ پر بھی کھلے
آنکھ تو میں جھیل کرنے سے رہا

امجد خان تجوانہ

غزل

ہم کس سے کہیں اپنے دل و جاں کی حقیقت
جانے نہ کوئی چاک گریباں کی حقیقت

ٹھکرایا ہوا پیار رہا دل کے قفس میں
کچھ اور نہیں ضبط کے زنداں کی حقیقت

دنیا کے ستائے ہوئے اب خاک نشیں ہیں
اتنی سی ہے اس شہرِ خموشاں کی حقیقت

دیکھے تھے اچانک ہی تباہی کے مناظر
بس اتنی سی تھی دیدۂ حیراں کی حقیقت

بک جاتا ہے آسانی سے اغیار کے ہاتھوں
معلوم ہے مجھ کو ترے ایماں کی حقیقت

باندھا تھا جو تو نے کبھی وہ ٹوٹ چکا ہے
میں جان گیا ہوں ترے پیماں کی حقیقت

ہنستے ہوئے پھولوں سے ہے فاروق یہ خالی
اب صرف اداسی ہے گلستاں کی حقیقت

زبیر فاروق العرشی

غزلیں

کسی کے ہجر میں خود کو جلا کے ہنستا تھا
عجیب شخص تھا آنسو چھپا کے ہنستا تھا

میں اس سے روٹھ کے آنکھیں سجا لیا کرتی
وہ اپنے ہاتھ سے چہرہ چھپا کے ہنستا تھا

کبھی جو ملتا تو آنکھوں میں اشک ہوتے تھے
بچھڑتے وقت گلے سے لگا کے ہنستا تھا

میں آج تک نہ سمجھ پائی کس لیے آخر؟
مجھے وہ خاک پہ لکھ کے مٹا کے ہنستا تھا

وہ اختلاف میں وعدوں کو توڑ دیتا تھا
مری جگہ پہ کسی کو بٹھا کے ہنستا تھا

سمے کی دھول میں ہے سب اٹا ہوا لیکن
یہی ہے یاد کہ وہ کھل کھلا کے ہنستا تھا

جویریہ کاظم

اسی اک بات پہ یہ دل بہت گھبرا گیا تھا
کہ میرا ضبط میری آنکھ تک جو آ گیا تھا

مجھے معلوم ہیں سارے شریعت کے تقاضے
مگر وہ شخص میرے دل کے اندر آ گیا تھا

بہت بے باک اور مضبوط عورت تھی میں لیکن
کسی کا ہجر جو اندر سے مجھ کو کھا گیا تھا

مرے دیوان ایسے میں بھلا کیا کام کرتے؟
وہ اک مصرع سنا کے سب کے دل پہ چھا گیا تھا

مجھے اپنوں سے ساری عمر ہی بس دکھ ملیں گے
مری تقدیر میں شاید یہی لکھا گیا تھا

ہمارا دور ہونا اس لیے بھی لازمی تھا
ہمارے درمیاں سارا زمانہ آ گیا تھا

غزلیں

ہم شعلہ بدست اتنی محبت سے جلے ہیں
جو دیکھنے والے تھے وہ حسرت سے جلے ہیں

خوشبو سے جلے ہیں کبھی صورت سے جلے ہیں
بدخواہ حسد کرنے کی عادت سے جلے ہیں

یہ شعلگی لو دینے سے آئی ہے کبھی باز !
سب حسن نظر والے عنایت سے جلے ہیں

جل جائے جہاں خون نہیں کھولتا ان کا
ہم برف زدہ لوگوں کی فطرت سے جلے ہیں

اک آگ کے دریا کو بتایا ہے چمن زار
ہم ڈوبنے والوں کی رعایت سے جلے ہیں

اس آگ میں راحت کے بھی سامان بہت تھے
سمجھائیں بھی کیسے کہ ضرورت سے جلے ہیں

کردار پر آنے ہی نہیں دی ہے کبھی آنچ
کچھ لوگ محبت میں مہارت سے جلے ہیں

عنبرین خان

توبہ کی جب تلک جسے مہلت ملی رہی
اس کی گناہوں پر ہی طبعیت اڑی رہی

اثبات کا جواز اسی سے بہم ہوا
آنکھوں میں ایک خواب سے جو روشنی رہی

جیسا کہ میری وجہ سے ٹوٹا ہو اعتبار
اک عمر مجھ کو خود سے ندامت بڑی رہی

شاید پلٹ بھی آتے کسی موڑ پر مگر
زنجیر اک اناؤں کی پاؤں پڑی رہی

گزری ہوئی بہار کے پھولوں کی یادگار
کچھ تو یہ شعر رہ گئے اور بے کلی رہی

غزل

اتنا ہی میرا کام تھا، بستی سے جاؤں میں
کوئی سنے تو آخری قصہ سناؤں میں

دریا عبور کرنے کو چھاؤں اجاڑ دوں
پاگل ہوں؟ پیڑ کاٹ کے ناؤ بناؤں میں

اے گریہ زار زندگی کچھ دیر معذرت
میرا بھی دل کیا ہے، ذرا مسکراؤں میں

رکھ لے کسی کباڑ کے مانند اپنے پاس
شاید برے دنوں میں ترے کام آؤں میں

ترکِ تعلقات ترا مشغلہ ہے اور
تجھ جیسے شخص کے لئے آنسو بہاؤں میں؟

مرجائے، جان چھوڑ دے اچھے دنوں کی یاد
رکھنے لگی ہوں یاد کی گردن پہ پاؤں میں

یہ لوگ چاہتے ہیں مری عمر ہو قلیل
یہ لوگ چاہتے ہیں تجھے بھول جاؤں میں

کومل جوئیہ

خراجِ عقیدت

مشہور اردو شاعر تلوک چند محروم کی برسی پر اُن کے منتخب اشعار

تلاطم آرزو میں ہے نہ طوفاں جستجو میں ہے
جوانی کا گزر جانا ہے دریا کا اتر جانا

اٹھانے کے قابل ہیں سب ناز تیرے
مگر ہم کہاں ناز اٹھانے کے قابل

اے ہم نفس نہ پوچھ جوانی کا ماجرا
موجِ نسیم تھی ادھر آئی ادھر گئی

بعد ترکِ آرزو بیٹھا ہوں کیسا مطمئن
ہوگئی آساں ہر اک مشکل بہ آسانی مری

یوں تو برسوں نہ پلاؤں نہ پیوں اے زاہد
توبہ کرتے ہی بدل جاتی ہے نیت میری

ہوں وہ برباد کہ قسمت میں نشیمن نہ قفس
چل دیا چھوڑ کر صیاد تہِ دام مجھے

دل کے طالب نظر آتے ہیں حسیں ہر جانب
اس کے لاکھوں ہیں خریدار کہ مال اچھا ہے

نہ رہی بے خودیِ شوق میں اتنی بھی خبر
ہجر اچھا ہے کہ محرومِ وصال اچھا ہے

صاف آتا ہے نظر انجام ہر آغاز کا
زندگانی موت کی تمہید ہے میرے لیے

دامِ غمِ حیات میں الجھا گئی امید
ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ احسان کر گئی

برا ہو الفتِ خوباں کا ہم نشیں ہم تو
شباب ہی میں برا اپنا حال کر بیٹھے

فکرِ معاش و عشقِ بتاں یادِ رفتگاں
ان مشکلوں سے عہد برآئی نہ ہو سکی

دستِ خرد سے پردہ کشائی نہ ہو سکی
حسنِ ازل کی جلوہ نمائی نہ ہو سکی

اس کا گلہ نہیں کہ دعا بے اثر گئی
اک آہ کی تھی وہ بھی کہیں جا کے مر گئی

نہ بھولے گا ہمیں محروم صبحِ روزِ محشر تک
کسی کا موت کے آغوش میں وقتِ سحر جانا

خدا سے وقتِ دعا ہم سوال کر بیٹھے
وہ بت بھی دل کو ذرا اب سنبھال کر بیٹھے

محمد اکرام رضوی

ایک من چلے شاعر کی کتاب پر چا کلیٹی تبصرہ

شروعات میں ہی معذرت چاہوں گی کہ اس نوخیز شاعر کو من چلا لکھ دیا کیونکہ وہ حد سے بھی زیادہ دل جلا ثابت ہوا تھا --- خیر ناظرین محترم قصہ کچھ یوں ہے کہ ایک دن موسم سوما کی دھوپ کا مزہ لینے کی ٹھانی تھی کہ دروازے پر گھنٹی بجی۔ میں نے لپک کر دروازہ کھولا تو ایک ڈاکیے کو اپنا منتظر پایا جس نے مجھے ایک کتاب تھمائی اور ساتھ ہی ایک رقعہ بھی، جس پر درج تھا کہ براہ مہربانی میری کتاب پڑھ کر ضرور تبصرہ فرمایئے گا۔ میں نے کتاب وصول کی اور واپس دھوپ میں بیٹھ گئی۔

خوش قسمتی سے فراغت کی شبھ گھڑیاں نصیب ہوئی تھیں تو سوچا کیوں نہ نئی نویلی کتاب کی ورق گردانی کی جائے تاکہ کچھ لکھا جائے۔

سو کتاب کو پڑھنا شروع کر دیا۔

پتہ یہ چلا کہ شاعری کی کتاب کے ذریعے محبوبہ کی زندگی کے ناتمام قصے زیب داستاں کیے گئے تھے۔ بس ایک محبوبہ کا نام ہی کسی شعر کی زینت نہیں بنایا گیا تھا کیونکہ ''منظور تھا پردہ ترا''

خیر آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا کو بروئے کار لاتے ہوئے میں پڑھتی گئی بلکہ یوں کہنا جائز ہوگا کہ ''پڑھتا جا شرماتا جا''

شروعات میں شاعری کا انداز خاصا چلبلانا اور عاشقانہ تھا کیونکہ محبوبہ ابھی کالج میں سال دوم کی طالبہ تھی اور روز روز کالج آنا جانا ہوتا تھا اور اکھ مٹکے و شغل میلے کے پورے مواقع میسر تھے۔

دن گزرتے گئے اور پانچ سے چھ غزلیں کالج کے زمانے کے شب و روز میں کھپا دی گئیں۔ اس کے بعد غزلوں کے مزاج میں اداسی چھا گئی کیونکہ ایک غزل کے آخری اشعار پڑھ کر پتہ چلا کہ محبوبہ کا رشتہ طے ہو گیا ہے۔ چونکہ شاعر پرلے درجے کا ہومیو پیتھک ثابت ہوا تھا اس لیے کوئی بھی بدمعاشانہ پھڈا ڈالنے کے بجائے شریفانہ انداز میں محبوبہ کو حوالہ رقیب کرنا زیادہ مناسب سمجھا گیا۔ جس کا تذکرہ غزل نمبر

سیدہ آمنہ ریاض

چار سو بیس میں کیا گیا تھا۔
یقین جانیے دو تین غزلیں پڑھ کر تو میرا اداسیانہ قہقہہ بلند ہوا کیونکہ اشعار سے صاف ظاہر تھا کہ محبوبہ کی رخصتی کے وقت شاعر دل جلا و بے پروا بھی اس دل خراش واقعے کا نہ صرف چشم دید گواہ تھا بلکہ سایہ قرآن میں سر پر برادرانہ شفقت نچھاور کرنے میں بھی پیش پیش تھا۔
یہ رلا دینے والا واقعہ اشعار نمبر دفعہ تین سو بیس میں واضح لکھا گیا ہے۔
میں نہ جانے کیوں اپنی ظالمانہ ہنسی نہ روک سکی لیکن پھر یاد آیا کہ ''دشمنڑ مرے تے خوشی نہ کریے سجنڑاں وی مر جانڑا'' کے تحت اداس ہی ہونا زیادہ مناسب سمجھا۔
میں اس بات کی منتظر تھی کہ شاید کچھ اشعار میں محبوبہ کے بھائیوں سے پے در پے چھتر کھانے کے واقعات درج ہوں گے لیکن حیرت انگیز طور پر ایسا نہ ہوا جبکہ محبوبہ کی گلی میں چکر لگانے اور بعد ازاں اس کے بچوں کو کبھی کبھار سکول چھوڑنے کا تذکرہ ملتا ہے۔ جس کا چشم دید گواہ محبوبہ کی گلی میں لگا سی سی ٹی وی کیمرہ ثابت ہوا۔
اس ماورائی و تصوراتی عشق کے قصے کے علاوہ حضرت شاعر کی لاچارگی و بیمارگی و غریبی و مفلسی و بے کسی کے تذکرے کے علاوہ واضح اور جلی حروف میں ایک شعر میں لکھا گیا تھا جس کا لب لباب کچھ یوں ہے کہ اے میری محبوبہ جب تم میری زندگی میں آو گی تو ان شاء اللہ تمہیں روٹی کپڑا اور مکان کے علاوہ سب کچھ ملے گا۔۔۔
شاعر جہاں انتہائی اعلیٰ درجے کا شریف تھا وہاں چوکھا ڈرپوک بھی ثابت ہوا۔ علاوہ ازیں اس طرح کی کئی محبوبائیں اس کی شاعری میں جا بجا نظر آئیں۔ مجھے شاعری پڑھ کر یوں معلوم ہوا کہ شاعر فلسفیانہ صلاحیتیں بھی رکھتا ہے کہ عشق کرو تو ایسا کہ کسی کو کان وکان خبر نہ ہو۔
کتاب کے آخری حصے میں جو غزلیات لکھی گئی تھیں ان کو پڑھ کر تو میری روح فنا ہوتے ہوتے بچی کیونکہ اس ساری عشقیہ واردات میں شاعر نامراد نے کبھی محبوبہ سے عشق کا اظہار ہی نہ کیا تھا۔۔۔
''کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے'' کے تحت مساں مساں کتاب ختم ہوئی تو تبصرہ لکھنے کی جسارت بے وقوفانہ کرنا چاہی پر ساتھ ہی اس عاشقی میں عزت سادات جانے کے خوف کے پیش نظر خاموشی سے کوٹ کی جیب خاص سے اکلوتی چاکلیٹ نکال کر کھانے پر ہی اکتفا کیا۔۔۔۔

☆☆☆☆☆

''استانی جی''

محلے بھر میں وہ استانی جی کے نام سے معروف تھیں- یہ جو کہتے ہیں نا ''ماواں ٹھنڈیاں چھاواں'' تو ٹھیک ہی کہتے ہوں گے مگر بد قسمتی دیکھیے؛ اس ٹھنڈی میٹھی چھاؤں کی راحتوں سے ہم عمر بھر محروم ہی رہے- ہم نے ماں کی شفقت اور محبت بہت کم دیکھی؛ بس تھوڑی سی اور یا شاید اپنی کم عمری کے سبب محسوس ہی نہیں کی- گاؤں اور محلے میں البتہ ہم نے ہر کسی کو یہی کہتے سنا کہ ''استانی جی کا جوڑ کہاں؛ آپ کی ماں تو فرشتہ تھیں جبھی تو اللہ میاں نے اتنی جلدی اسے اپنے پاس بلا لیا.....''-

پتہ نہیں اللہ رب العزت ان فرشتوں کو کیوں اتنی جلدی اپنے پاس بلا لیتے ہیں؛ وہاں ان کی بھلا کیا حاجت؛ ان فرشتوں کی ضرورت تو یہاں ہم انسانوں کے بیچ ہی زیادہ محسوس ہوتی ہے.....!!!

میں بہت چھوٹا تھا جب میری ماں مر گئی تھی- گھر میں میرے علاوہ میرا ایک بڑا بھائی اور مجھ سے تین چھوٹی بہنیں تھیں- جب میں خود قریب قریب آٹھ دس سال کا تھا تو مجھ سے چھوٹی بہنوں کی عمریں اور قد کاٹھ بھلا کیا ہو سکتی تھی؛ ہاں اتنا یاد ہے، سب سے چھوٹی بہن ماں کی گود میں پل رہی تھی اس وقت- بابا جان نے قدرت کے قانون کو للکارا تھا اور یا شاید فطرت کے اصولوں کو ٹھینگا دکھایا تھا تب ہی تو اتنی مشکل اور بھاری ذمہ داریاں یک دم آن پڑی تھیں ان پر- ان کو بہت جلد خمیازہ بھی بھگتنا پڑا- دھچکا شدید تھا- سخت پچھتاوے نے انھیں زندگی بھر کبھی دم لینے ہی نہیں دیا- ماں جی اپنا وقت پورا ہونے سے قبل ہی حالات سے ہار گئیں تھیں، حق زوجیت کو مزید ادا نہ کر پائیں اور ایک رات کو اچانک ہی اپنے بچوں کو سسکتا چھوڑ کر اپنی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند کر لیں-

سانحہ بہت بڑا تھا- بھرا پرا گھر ویران ہو کر رہ گیا تھا- بچے بے آسرا ہو چکے تھے- بابا جان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے؛ شدید گھبراہٹ میں حواس ہی کھو بیٹھے اور اماں جی کی وفات کے تین دن تک مسلسل قبرستان میں اماں جی کی قبر کے سرہانے بیٹھ کر چیختے چلاتے رہے؛ سر اور سینہ پیٹتے رہے مگر کوئی شنوائی نہیں ہوئی-

نور کمال شاہ

رونے دھونے سے نظام کائنات نہیں رکتا؛ چیخنے چلانے سے بھی بھلا کہیں آسمان پھٹ پڑا ہے کبھی؟

گاؤں والے جا کر انہیں تھام کر اور سمجھا بجھا کر واپس گھر پہنچا آتے کہ صبر کرو، اللہ کے کاموں میں کسے بھلا کیا دخل، اب اپنے گھر اور بچوں ہی کا کچھ خیال کرو مگر وہ اگلے دن دوبارہ گریہ و زاری اور اپنا ماتم کرنے قبرستان پہنچ جاتے - دیر تک روتے اور چلاتے رہتے - قدرت کے قانون کو بدلنے چلے تھے وہ - پتہ نہیں کیوں اور کیسے انہیں یہ یقین ہو چلا تھا کہ ماں جی کو ان کے ساتھ قبرستان سے زندہ واپس آنے کی اجازت مل جائے گی مگر بے سود؛ کیا مردے بھی کبھی زندہ ہو کر گھر لوٹے ہیں بھلا!!!

ماں جی کی ازدواجی زندگی اچھی یا پُرسکون کبھی نہیں رہی - وہ ساری عمر سکون کو ترستی رہیں اور عین جوانی میں ہمت ہار کر ہاتھ پیر کھلے چھوڑ دیے - پانچ بچوں کو دوسروں کے سہارے یتیم و بے آسرا چھوڑ کر اچانک ہی ملک عدم کو سدھار گئیں - ذاتی رنجشوں، خاندانی نفرتوں، مالی بدحالی اور بابا جان کی بری عادتوں نے گھر کو پہلے ہی جہنم بنا رکھا تھا - محلے والوں کو روزانہ کی بنیاد پر جھگڑے، چیخ و پکار اور لڑائی مار کٹائی کے نظارے فری میں دیکھنے کو مل جاتے تھے - اور یہ سلسلہ ان کی شادی کے ماہ ڈیڑھ ماہ بعد سے متواتر جاری تھا - ہاں ایک بات البتہ واضح تھی - اہل محلہ ماں جی کو بے قصور ضرور سمجھتے تھے اور ان سے دلی ہمدردی بھی رکھتے تھے - وہ اپنے تئیں بابا جی کو روکنے اور انہیں اس طرز عمل سے باز رکھنے کی بھرپور کوشش بھی کرتے مگر نشے اور جوے کی بری لت میں مبتلا بابا جان کو روکنا اور باز رکھنا محال تھا - وہ کسی کی بھی نہیں سنتے تھے.....!!!

بابا اور اماں جی کی لڑائی میں سے کون حق پر تھا اور کون غلط، مجھے علم نہیں تھا البتہ ماں جی کو میں نے ہمیشہ پٹتے اور سسکتے ہوئے ہی دیکھا - ماں جی کے سامنے بڑا مسئلہ خود کو مار پیٹ سے محفوظ رکھنا نہیں بلکہ اپنے گھر اور پانچ بچوں کو اس جبر اور افتاد سے بچا کے رکھنا تھا - اپنے حصے کی مار کے علاوہ انھوں نے ہمارے حصے کے تھپڑ اور مکے بھی اپنے چہرے پر سہہ لیے اور ڈھال بن کر ہمارے اوپر برستے ڈنڈوں کے لیے ہم سے پہلے ہمیشہ اپنی پیٹھ آگے کر دی -

اماں جی اپنے محلے کی ہر دلعزیز خاتون تھیں - نیک، شریف اور قرآن خوان تھیں اس لیے ہر کوئی انہیں پسند کرتا تھا - محلے بھر میں ان کا احترام بھی بہت تھا - پورے محلے کی بچیاں اور بڑی عمر کی لڑکیاں صبح صبح ناظرہ پڑھنے اور قرآن پاک سیکھنے ان کے پاس جمع ہوتی تھیں - گھر کے کام کاج سے

فارغ ہوتے ہی آس پاس گھروں کی خواتین بھی ہمارے گھر اکٹھی ہو جاتیں اور دیر تک محفل جمی رہتی- چھوٹا سا کرائے کا گھر تھا ہمارا مگر خوشحال خاندان کا تصور ہی مفقود تھا- گھر کی مشکلات زیادہ تھیں اور بڑا مسئلہ سکون و اطمینان کا تھا- سکون نامی چیز گھر میں سرے سے ناپید تھی-

شوہر کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد اماں جی نے اپنے تئیں گھر کو چلانے کی کوشش کی- کشیدہ کاری میں وہ ماہر تھیں؛ کپڑوں پر پھول یا بیل بوٹے وغیرہ کاڑھنا بھی انہیں آتا تھا- اس ہنر کو گھر چلانے کے لیے استعمال کرنے لگیں- مجھے اور بڑے بھائی کو چھولے پکا کر بیچنے بازار بھیجتیں؛ یہاں تک کہ کئی بار بازار سے تمبا کو منگوا کر نسوار کی ٹکیاں تک بنائیں اور ہمیں بیچنے بازار بھیج دیا مگر آزمائشیں ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں- ہمارے کمائے چار پانچ روپے اونٹ کے منہ میں زیرہ ثابت ہوتے تھے-

وہ گھر کو سہارا دیتے دیتے خود کمزور پڑ گئیں تھیں- جانے کتنے روگ پال رکھے تھے انھوں نے اپنے کمزور بدن میں- مرض نہ بھی ہو تو گھر کے فکر و پریشانیاں ہی ان کے مرنے کے لیے کافی تھیں؛ سو وہ مر گئیں.....!!

ہم سے ہماری ڈھال چھن گئی.....!!!

محلے والوں سے ان کی استانی جی الگ ہو کر ان دیکھی سفر پر روانہ ہو گئیں.....!!!

اماں جی کے انتقال کے تیسرے دن جب دور پار کے رشتہ دار اپنا اپنا سامان سمیٹ کر رخصت ہونے لگے تو بابا جان سے الوداعی ملاقات میں بچوں کا بہت خیال رکھنے کی تاکید کے ساتھ ساتھ دو تین گھرانوں نے ایک ایک بچہ اپنے ساتھ لے جانے اور اس کے پرورش کی پرخلوص پیشکش بھی کی مگر بابا جان جواباً ہلکی سی مبہم مسکراہٹ کے ساتھ فقط اتنا بولے کہ فی الحال تو میں زندہ ہوں ہاں میرے بعد آپ لوگوں کا جو جی چاہے کر لینا-

وقت کی رفتار کبھی بھی دھیمی نہیں ہو سکتی؛ حادثات، سانحے اور کٹھنائیاں وقت کے پرسکون گود میں سما کر ماضی کا حصہ بن جاتی ہیں؛ ہاں ان کی چبھن زندگی بھر محسوس ہوتی ہے- ماں جی کو کھونے کے بعد ہمارا سفر رکا نہیں بلکہ اس کی رفتار تیز تر ہو گئی- ہم سب بہن بھائی آج ایک کامیاب اور مثالی زندگی کے دعوے دار ہیں اور وقت کا پہیہ ہمارے حق میں ہی گھوم رہا ہے مگر اماں جی کی یادیں آج بھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتیں- ہر اچھے موقع پر، ہر بری گھڑی میں ماں جی ہماری رفیق ہوتی ہیں.....!!!

☆☆☆☆☆

زاہد ہما..... منشی پریم چند ثانی

ہر پنجابی ادبی تنظیم کے اجلاس کے بعد آواز بلند ہوتی ہے یار زاہد ہما بڑا بیبا بندہ اے او نئیں۔

زاہد ہما بڑا مغرور آدمی اے نئیں نئیں یار اے بڑا کہانی کار اے او یار بس کر، زاہد ہما تے شاعر اے، اے وی غلط فہم اے، او تے ریڈیو دا بندہ اے، سکرپٹ رائٹر اے، او ہو، یار راہٹر نوں چھڈو، او تے اپنے ماں پیو دا لاڈلا پتر اے، نالے سرکاری ملازم اے..... یار اس دی سب تو وڈی خوبی کی اے اس دے بارے پتہ کوئی نئیں، بس او یاراں دا یار اے۔ اب اتنی ساری باتوں میں سے زاہد ہما کا برآمد ہونا بلکل ایسے ہی ہے جیسے گریہ وزاری کی فضا میں تابوت کا برآمد ہونا، اور یہ کام اس وقت زیادہ مشکل ہو جاتا ہے جب یہ پتہ چلتا ہے کہ زاہد ہما راجانیر کا دوست ہے اور دوست بھی ایسا کے لوگ سمجھ ہی نہیں پاتے کہ کون کس کا دوست ہے اسی لیے اکثر لوگ اُن دونوں کو اکٹھے دیکھیں تو پکار اُٹھتے ہیں کے لو جی، راجا زاہد ہما نیر تشریف لے آئے نیں۔ زاہد ہما صوبوں میں اتحاد کا خواہش مند ہے اسی لیے پشاوری جوتی کے ساتھ ہمیشہ پنجابی جراب پہنتا ہے۔ پنجابی شعرا میں دوستی کا رواج بہت کم رہا ہے مگر زاہد ہما کی دوستی راجانیر سے راجا نیر کی دوستی عمران نقوی سے، عمران نقوی کی دوستی اطہر منیر سے ہوتی ہوئی دوسرے شعرا تک بھی جاتی ہے، مگر یہ دوستی ایسی ہے کے مل گئے تو بسم اللہ، نہ ملے تو لعنت اللہ۔

زاہد ہما کا تعلق جڑانوالہ سے ہے اس لیے یہ کافی عرصے سے لاہور کی جڑوں میں بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے والد صاحب ٹیچر تھے اس لیے یہ باقی دنیا کو، شاگرد سمجھتا ہے اگر کوئی بندہ اس کو اُستاد کہہ دے تو یہ فوراً کہتا ہے یار

اعجاز رضوی

توں پاگل ایں۔ میں اُستاد کوئی نئیں، میں تے شاعر آں شاعر۔

ایک زمانہ تھا جب ادب میں جوڑیاں مشہور تھیں۔ عطاالحق قاسمی، امجد اسلام امجد، خالد احمد، نجیب احمد، فرحت عباس شاہ، علی نواز شاہ، بلکل اسی طرح زاہد ہما اور راجانیز کی جوڑی تھی۔ دونوں ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ زاہد ہما کی مونچھیں تھیں، اس لیے لوگوں کو یقین تھا کہ یہ مونچھوں والا ہی اس کلین شیو بندے کے جملہ اخراجات اٹھاتا ہے۔ اور دیگر فوائد سے بھی لطف اندوز ہوتا ہے۔

سنتے آئے ہیں کہ پرندہ ہما اگر کسی کے سر پر بیٹھ جائے تو وہ شخص بادشاہ بن جاتا ہے مگر زاہد ہما وہ پرندہ ہے کہ جس کے سر پر بیٹھ جائے وہ گنجا ہو جاتا ہے یقین نہ آئے تو فوری طور پر راجا نیز کو دیکھ لیں۔

ایک زمانہ تھا جب زاہد ہما، تعلقات عامہ کا افسر اعلیٰ بن کر خانیوال ٹرانسفر ہو گیا تھا، تب ادبی بیٹھک میں خالد احمد روزانہ اس کا ذکر کرتے اور خوش ہوتے۔ ایک دن اچانک زاہد ہما ادبی بیٹھک میں داخل ہوا تو خالد احمد بہت خوش ہوئے، زاہد ہما نے پُر جوش انداز میں کہا، خالد احمد میں واپس لاہور آ گیا واں۔

تو خالد احمد نے برجستہ کہا، اچھا توں واپس لاہور آ گیا ایں، تے ہن داتا صاحب دا کی بنے گا۔ خالد احمد کی اس بات پر سب نے قہقہہ لگایا، مگر زاہد ہما نے بڑی سنجیدگی سے افسر اعلیٰ بن کر کہا خالد صاحب کوئی گل نئیں، مینوں پتہ اے، میں ہن کی کرنا جے۔ زاہد ہما مہذب ہونے کے چکر میں اکثر اتنا آہستہ بولتا ہے کہ سننے والے کے سر میں درد ہو جاتا ہے اور بات پھر بھی سمجھ میں نہیں آتی۔

کبھی کبھار یہ صحیح طور پر ہنسے تو اس کی مونچھوں کی جھالر سے اس کے دانت بھی نظر آ جاتے ہیں کبھی کبھی یہ بہت پُر جوش انداز میں اپنی تعریف کر رہا ہو تو یوں لگتا ہے جیسے گناہ کبیرہ کر رہا ہے۔

یہ عام طور پر خود کو دانشور ہی سمجھتا ہے مگر اندر سے سیدھا سادہ دیہاتی پنجابی ہے اور دعدے کا بڑا پکا ہے، ایک دن اس نے کہا میں ماہنامہ بیاض، کے آفس میں آؤں گا، پھر اس کا فون آیا، سر جی، میرے محترم میرے سوہنے لکھاریشاعر تسی ___ ابھی اس نے تسی کہا ہی تھا کہ میں نے اکتا کر کہا یار گل دسو، کہنے لگا محترم میں ٹھوکر تے کھڑا واں، ہن دسو مشرق ول جانا اے یا مغرب ول میں نے کہا تسی ملتان والی سڑک تے ہو یا لاہور والی، تو بولا، پتہ نہیں یار دونوں سڑکاں نال نال نیں۔ میں نے کہا یار زاہد ہما ٹھوکر دی وڈی سڑک تے ہتھ چک کر کھڑا وہ جا، سویرے جس پاسے سورج نکلے اس پاسے چل تے 8 کلو میٹر تے ''بیاض'' دا دفتر آ جائے گا اس نے بڑی معصومیت سے جواب دیا، سر جی میرے محترم اس طرح تے میں لیٹ ہو جاواں گا۔

زاہد ہما اکثر شوق سے کالی شلوار قمیض پر کوٹ پہنتا ہے، اور کبھی کبھی کسی وڈیرے کی طرح چادر کی بکل بھی مارتا ہے، مگر شکل وصورت سے وڈیرے سے زیادہ اس کا منشی لگتا ہے۔ اس کی مونچھوں اور سر کے بالوں کا سٹائل بہت قدیمی ہے۔ کرسی پر بیٹھا ہو، تو دونوں کونیاں میز پر رکھ کر انگلیوں کو ہلا ہلا کر اپنی بات سمجھاتا ہے اور بات کرتے ہوئے، بڑی نزاکت سے ہونٹوں کو بھینچ بھینچ کر بات مکمل کرتا ہے۔ یہ سر کے بال اور مونچھوں کو بچپن سے ہی بلیک کرنے کا شوقین ہے، یہ خود کو نوجوان ثابت کرنے کے لیے، اکثر بزرگ خواتین کے قریب رہنا پسند کرتا ہے اور دل ہی دل میں آنٹی کے قربان بھی جاتا ہے، اگر ذرا سا کھٹکا ہو یا راجا نیز آ جائے، تو فوراً باجی جان باجی جان کی رٹ لگانے لگتا ہے۔ زاہد ہما جوانی میں خواتین شاعرات سے دوستی کو اعزاز سمجھتا تھا، اور ہر شاعرہ کی شادی کی خبر پر ایسے رنجیدہ ہو جاتا تھا جیسے اس کی سگی محبوبہ ڈولی چڑھ گئی ہو، کبھی کبھی تو یہ ایسی صورت میں قتل و غارت کے بارے میں بھی سوچتا تھا، اور خنجر لے کر میدان میں آ جاتا تھا، پھر وہی خنجر اپنے پیٹ میں مار لیتا تھا، لوگ گھبرا کر فکر مندی سے اس کو بچانے کے لیے آگے بڑھتے تو یہ بڑے پرسوز انداز میں کہتا، ہٹ جاؤ، پیچھے ہٹ جاؤ، اے کھڈونے والا خنجر اے، میں پاگل آں ''اصلی خنجر ماراں'' اور جناب میرے محترم میں تے اجے اگلی کڑی دے ویاہ تے بھی رونا پانا اے، میں مر گیا تے یہ رسم گریہ کون ادا کرے گا۔

کوئی شاعرہ زاہد ہما کو ہجر میں مبتلا کرے یو اس کا بدلہ اپنی بیگم سے لیتا ہے اسی لیے اس کے چودہ بچے ہیں جبکہ دو تین بچے اس نے سسرال میں تقسیم بھی کر دیئے ہیں، اس لیے آج تک تعداد پوری کرنے کے چکر میں لگا ہوا ہے، شروع شروع میں لوگوں نے زاہد کو بچے کی پیدائش پر مبارکباد دی تھی، مگر پھر خلقت، یہ کہنے پر مجبور ہو گئی، کہ چھڈ یار اے تے ہر سال وانکا ہے، زاہد ہما کو معلوم ہے کہ مولوی اور پیروں کے ہاں اسی طرح اولاد ہوتی ہے اس لیے اس نے بھی اچھے بھلے زاہد ہما کو شاہ میں بدل لیا ہے۔

زاہد ہما اپنی بات کو اتنی تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ سننے والا بھاگ کر بس میں چڑھ جاتا ہے۔ اور زاہد ہما پکارتا رہتا ہے کے یار سن تے لے مختصر گل اے، پھر ناامید ہو کر کہتا کہ میرا کی اے۔ میں فیر کسی مہینے گل مکمل کر لاں گا۔

مگر توں تے یار مار مشہور ہو یا ایں۔ زاہد ہما نے 1990-91 میں بہت شاعری کی، اس زمانے میں بہت زیادہ تھا، مشہور پنجابی شاعر منظور احمر سے اس کا ملنا جلنا بہت زیادہ تھا، منظور احمر صاحب گیت لکھتے تھے سکرپٹ رائٹر تھے، اور میرے ہمسائے تھے۔ ایک دن زاہد ہما اسلام پورے آیا تو منظور احمر سے ملنے کا خواہش مند ہوا میں نے منظور احمر صاحب کو بتایا کہ زاہد ہما آیا ہے تو وہ بڑے فکر مند ہوئے اور فوراً گھر کے اندر جا کر کنڈی لگا دی۔ اور اندر سے بولے شاہ جی

تسی کہو منظور احمر گھر تے نئیں، پھر اوپری منزل سے جھانک کر بولے یار برا نہ ماناں میں کھڑکیاں بند کر رہیا واں کیونکہ مینوں شک اے زاہد ہما پانی دا پائپ پھڑ کے اُتے آ گیا تے شعر وی سنائے گا، نالے پائپ وی خراب کرے گا۔

زاہد ہما اپنی ہر حرکت کی حفاظت کرتا ہے، یہ کچھ کرنے سے پہلے دیکھتا ہے کہ کوئی اُسے کوئی دیکھ تو نہیں رہا، جب اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ کوئی نہیں دیکھ رہا تو یہ وہ حرکت نہیں کرتا، کیونکہ اس کا خیال ہے حرکت کوئی نہ دیکھے تے فائدہ کی۔

اس کی پہلی کتاب جو اب تک کی آخری کتاب ہے، وہ ہے 'سوچ دی چک' اس کے بعد کا سارا کلام، اور الزام ابھی تک اس کے گھر پر رکھا ہے، اس نے کچھ پنجابی مانیکر و فکشن بھی لکھا ہے، مگر ڈرتا ہے کہ لوگ کیا کہیں گے حالانکہ یہ بات تو شاعری کرنے سے پہلے بھی سوچی جا سکتی تھی کہ لوگ کیا کہیں گے، جس زمانے میں زاہد ہما کو اُردو شاعری کا شوق ہوا تھا اس زمانے میں یہ خالد احمد کے ساتھ جڑ گیا تھا، اور پورے ذوق و شوق کے ساتھ اُردو شاعری سکھا رہا تھا، اور پھر لوگوں نے دیکھا کہ اس کے ذوق و شوق سے متاثر ہو کر خود خالد احمد صاحب بھی اپنے لیے اُستاد تلاش کرنے لگے تھے۔

زاہد ہما دیکھنے میں کہیں کا بھی نہیں لگتا نہ کسی عمر کا لگتا ہے جبکہ سرکاری ملازمت سے ریٹائرمنٹ بتا رہی ہے کہ یہ ساٹھ سال کا ہو چکا ہے، اس کی جسمانی فٹ نس اولاد کی کثرت اور خفیہ طاقت روحانی کو دیکھ کر اکثر نامور ڈاکٹر اور حکیم اس سے مشورہ کرتے ہیں۔

یہ اُردو میں لکھتا ہے، پنجابی میں سوچتا ہے، اور کوشش کرتا ہے کہ انگریزی میں ادا ہو، آپ پنجابی شاعری پر خوش ہوں تو یہ انگریزی کا ذکر کرتا ہے، انگریزی پر خوش ہوں تو یہ اپنی کہانیوں کا ذکر کرتا ہے۔ جب مجبور ہو کر آپ اس کی اُردو نما انگریزی اور پنجابی نما اُردو کا ذکر کریں تو یہ اپنی شخصیت پر بات کرنے لگتا ہے، اور تعلقات عامہ جیسی اہم پوسٹ پر تعیناتی کا ہونا اور بڑے لوگوں سے ملنا بڑی تفصیل سے بیان کرتا ہے۔

اسی لیے میں نے بھی بڑی تفصیل سے اس کا ملنا رقم کیا ہے کہ صرف زاہد ہما ہی بڑے بڑے لوگوں سے نہیں ملتا، میں بھی بڑے لوگوں سے ملتا ہوں اور انھیں جانتے ہوں اور میرے علم کے مطابق، بڑے بڑے لوگوں بڑے بڑے دوستوں بڑے بڑے شاعروں اور بڑے بڑے انسانوں کی فہرست میں خود زاہد ہما کا نام بھی سرفہرست ہے۔

اور زاہد ہما کی قدیمی دوستی پر فخر کرتا ہوں اور میرے بال دیکھ کر آپ اندازہ لگا لیں کے میں نے ہما کو کبھی سر پر نہیں بٹھایا۔ ورنہ میں بھی آج راجا نیز ہوتا اور سر پر ٹوپی رکھے ہما کے سر پر بیٹھنے کا انتظار کر رہا ہوتا۔

☆☆☆☆☆

کھانسی

وہ اپنے پیر مرشد کے قدموں کو چومتے ہوئے بولا، اعلیٰ حضرت مجھ پہ اپنی شفقت اور مہربانی کا ہاتھ رکھ دیجئے۔ میں نے تو کل آپ کی کرامت دیکھی تو یقین آیا کہ آپ تو روئے زمین پہ سب سے اعلیٰ و افضل ہستی ہیں۔ آپ تو میرے دین ایمان کا مرکز بن گئے ہیں۔

پھر نے اپنی آنکھیں پھیلا کر گھمائیں اور اپنے سرخ و سفید اور موٹے تازے ہاتھ سے اس کے بال کھینچے ہوئے دل سے بولا کم بخت کیا ہوا۔ زیادہ چرس پی کر بھوکا نہ رہا کر۔ انتڑیاں سوکھ جاتی ہیں۔ جا کوئی گرم اور تلی ہوئی چیز کا تیرے دماغ معدے میں اتر کے سکڑ ہی نہ جائے۔

اس نے روہانسا ہو کر پیر کے پاؤں پکڑ لیے۔ اور دیوانوں کی طرح انہیں چومتے ہوا بولا۔ اعلیٰ حضرت اگر آپ واقعی سُن لیں۔ تو میری کیفیت کا اندازہ ہو جائے گا۔ آپ کی کرامت میری گناہ گار آنکھوں نے خود دیکھی ہے۔ پھر اچانک سنبھل گیا۔ اس نے تخت پہ لٹکے ہوئے پاؤں کھینچ کر اپنی رانوں کے پنجے دبا لیے۔ اور پراسراریت طاری کرتے ہوئے آنکھیں بند کر کے تسبیح گھمانے لگا۔

مرید نے اس کے گھٹنے چھوتے ہوئے عاجزی سے کہا۔ سرکار کل جب میں آپ کی بارگاہ سے نکلا تو مجھے کونے میں رہنے والے ڈاکٹر صاحب نے پکڑ لیا۔ وہ جاگنگ کرتے ہوئے گھر جا رہا تھا۔ میں نے انہیں سلام کیا۔ تو اُس نے آپ کے خلاف غلط زبان استعمال کرتے ہوئے مجھے طعنہ دیا۔ کہ میں نے اپنا دین ایمان ضمیر اور روح آپ کے قدموں میں رکھ دیا ہے۔ پیر کے جسم پہ لرزہ دیکھ کر مرید کا سینہ پھول گیا۔ حضور میں نے

کلیم خارجی

پہلی مرتبہ ان کی سخت بے عزتی کی۔ لیکن اس نے مجھے کچھ کہنے کی بجائے آپ پہ طرح طرح کے الزامات لگانے شروع کردیا۔ اس نے آپ کے بردہ فروش، منشیات فروش، بدقماش افسروں کا خفیہ خدمت گار اور دلال، جھوٹوں کا ضامنتی اور شہر کے گندے ماحول کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے کہا، کہ وہ آپ کو بچپن سے جانتا ہے۔ اس نے آپ کے جسمانی بیماریوں کا ذکر کر کے آپ کو اس زمین کا سب سے اور مکروہ آدمی کا لقب دے ڈالا۔ پیر صاحب کے جلال میں شدت آنے لگی۔ تو مرید عقیدت سے لہجہ میٹھا کرتے ہوئے بولا، پھر حضور والا۔ ایک دم ڈاکٹر صاحب کو کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ کہ وہ کھانستے کھانستے نیچے بیٹھ گیا۔ ان کی حالت دیکھ کر میں تو انہیں چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اس دوران پیر صاحب کے بہت سے مرید بھی اندر آ گئے۔ پیر صاحب نے لمبے اور گہرے سانس لے کر اپنے جسم پر لرزہ طاری کرتے ہوئے کہا۔ تو ہم رات بھر یونہی تو نہیں کھانستے رہے۔ جب ہمیں کھانسی ہوتی ہے۔ تو ہمیں اندازہ ہو جاتا ہے۔ کہ کوئی ہماری پیٹھ کا گوشت نوچ رہا ہے۔ پھر ہم خوب کھانستے ہیں۔ اور ہماری کھانسی اس آدمی کو لے ڈوبتی ہے۔ جو ہماری پیٹھ کا گوشت اپنے دانتوں سے کاٹ رہا ہوتا ہے۔

بالکل، بالکل حضور والا ایسا ہی ہوا ہے۔ مرید ایمان کے زور سے روتے ہوئے بولا، مرید کے جذباتی اور پیر کے جلال کو دیکھ کر جمع ہونے والے تمام مریدوں نے قطار بنالی۔ اور باری باری پیر کا گھٹنا چھو کر اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونے لگا۔ پیر نے دوبارہ آنکھیں بند کرلی۔ اور پھر زور زور سے کھانسنا شروع کیا۔ مرید زور سے چیخا۔ لو پھر کسی کا بُرا وقت آ گیا۔ پھر کوئی ڈوبنے والا ہے۔ ایک اور آواز آئی۔ کوئی لعنتی جان سے جانے لگا ہے۔ مریدوں کا جوش دیکھ کر پیر کی کھانسی تیز ہوتی گئی۔ اس کی سانس پھول گئی اور آنکھیں پھیل کر باہر آ گئی۔ کھانستے کھانستے پیر تخت سے نیچے گر پڑا۔ مریدوں نے کھانس کھانس کر اُسے اُٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ ٹھنڈا ہو کر سخت اور بے جان ہو گیا۔ اُسکی حالت دیکھ کر چند مریدوں نے زور زور سے رونا شروع کردیا۔ اور بہت سے کھانستے ہوئے بارگاہ سے غائب ہو گئے۔

☆☆☆☆☆

نئے سال کی نئی کہانی

سنگیتا ہریانے کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئی باپ کسان تھا اور اَن پڑھ بھی گاؤں والے اسے کلو کسان کہتے تھے لیکن اس کا خواب تھا کہ بیٹی کو خوب پڑھائے گا اس لیے اس نے سنگیتا کو قریبی قصبے کے انگریزی سکول میں داخل کروادیا۔

وہ روزانہ اپنی سائیکل پر بٹھا کر اس کو سکول چھوڑنے جاتا اور سارے راستے اسے کہانیاں سناتا رہتا۔ سنگیتا جب سکول یونیفارم پہن کر بستہ کمر پر لادے چلتی تو وہ اس کو دیکھ کر نہال ہو جاتا اور سنگیتا کی ماں سے کہتا ''دیکھو ہماری چھوری ملکہ جیسی ہے۔ جیسے انگریزوں کے دیس کی ملکہ ہووے''۔

سنگیتا بھی بہت ذہین تھی اس کا پڑھائی میں من بھی بہت لگتا تھا۔ وہ ہر کلاس میں اول پوزیشن لینے لگی۔ اور ہائی سکول بھی پاس کرلیا۔

کلو کسان نے بیٹی کو دہلی کے کالج میں پڑھنے بھیج دیا وہ کمپیوٹر سائنس پڑھنے لگی اب کلو کسان کو اس کے بیاہ کی فکر ہوئی اس نے سنگیتا کی شادی کے لیے رقم جمع کرنی شروع کی۔ لیکن سنگیتا جب بھی گھر آتی تو باپ سے کہتی ''باپو مجھے لندن بھیج دو میں نے آگے پڑھنا ہے۔

''کلو کسان کہتا بیٹا'' تو گاؤں کی سب سے زیادہ پڑھی لکھی چھوری ہے یہی بہت ہے اب میں تیرا بیاہ کرواؤں گا دیکھنا کتنے اچھے اچھے رشتے آئیں گے تیرے لیے۔''

مگر سنگیتا کی ضد تھی کہ اسے لندن جا کر پڑھنا ہے۔ اس نے خود ہی لندن کے ایک کالج میں درخواست بھیج دی۔ اس کو داخلہ مل گیا۔

اب اس نے باپ سے کہا'' باپو جو رقم تو نے میرے واج کے لیے رکھی ہے مجھے دے دے۔ پہلے لندن سے پڑھ آؤں پھر بیاہ کروالوں گی۔ وہاں پڑھائی کے ساتھ کام بھی مل جائے گا۔ تمھیں میری شادی کی فکر نہیں ہونی چاہیے خوب پیسہ اور ڈگری لاؤں گی پھر ہم شہر جا کر رہیں گے۔

بیٹی کی ضد کے آگے کلو کسان کیا کرسکتا تھا۔ اس نے پہلے پہل انکار کیا سمجھانے کی کوشش کی مگر پھر سنگیتا کو لندن جانے کی اجازت دے دی۔

سنگیتا کا بچپن کا خواب پورا ہو رہا تھا۔ وہ ناچتی پھر رہی تھی۔ اس نے جلدی جلدی سب تیاری کر لی۔ اور باپو کو روتا چھوڑ کر جہاز میں بیٹھ گئی۔

نیلما ناہید درانی

لندن کے ہیتھرو ائرپورٹ پر اتری تو اک نئی دنیا تھی جہاں چاروں طرف نظارے ہی نظارے تھے۔ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں مگر دل بلیوں اچھل رہا تھا اسے یاد آیا اس کا باپو روزانہ اسے سکول چھوڑتے ہوئے کہتا تھا ''میری چھوری تو ملکہ ہے''

سنگیتا لندن کی سڑکوں پر چلتے ہوئے خود کو ملکہ جیسی ہی محسوس کر رہی تھی۔

کچھ دن ایک ہوٹل میں گزارنے۔ کالج جا کر اپنے کاغذات جمع کروانے اور کلاس میں حاضری لگانے کے بعد اس کو ایسی رہائش کی تلاش تھی۔ جو سستی بھی ہو اور کالج کے قریب بھی۔

اس نے کالج کے لوگوں اور آن لائن تلاش شروع کی تو اسے ایک گھر میں ایک کمرہ کرایے پر مل گیا۔ چھوٹا سا کمرہ تھا جسے ایک دوسری لڑکی کے شیئر کرنا تھا۔ دو کمروں کے تنگ سے گھر کا دوسرے کمرے میں مالک مکان اس کی بیوی اور دو بچے تھے کچن اور باتھ روم شیئرنگ پر تھا۔ جس کے لیے صبح جلدی اٹھنا پڑتا تا کہ باتھ روم فارغ ملے ناشتہ کالج جاتے ہوئے خرید کر کر لیتی لیکن وہ مہنگا پڑتا تھا ٹرین اسٹیشن تک دوڑ کر جانا پڑتا ورنہ ٹرین مس ہو جاتی تو دوسری ٹرین کے لیے انتظار کرنا پڑتا اور کلاس میں غیر حاضری لگ جاتی۔

اب اسے پریشانی شروع ہوئی۔ سنگیتا کو کھانا بنانا بھی نہیں آتا تھا۔ گاؤں میں اسے کوئی کام نہیں کرنا پڑتا تھا کپڑے دھلے ہوئے استری شدہ ملتے تھے مگر اب سب کام خود کرنے پڑتے اس کو کبھی کبھی خیال آتا کہ باپو کی بات مان لیتی تو یہ سب جھمیلے نا کرنے پڑتے جو لندن میں آ کر کرنے پڑ رہے تھے۔ ان سب کے ساتھ کام کی تلاش بھی تھی کیونکہ وہ اپنا خرچہ خود اٹھانا چاہتی تھی۔

اسے ایک دکان پر کچھ گھنٹوں کی نوکری بھی مل گئی، مگر جس گھر میں رہ رہی تھی وہاں گزارا کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ مالک مکان کی روزانہ کوئی نا کوئی چخ چخ سننی پڑتی۔ دن بھر کی تھکن کے بعد اپنی مرضی سے چائے تک نہیں بنا سکتی تھی۔

اس نے اپنے کالج کے دوستوں سے اس کا ذکر کیا۔ اس کے کالج میں بہت سے انڈین طالب علم بھی تھے جن میں سے ایک نے جس کا نام آدیتہ تھا نے کہا کہ ان کے گھر میں ایک روم خالی ہے اگر وہ لینا چاہے۔

سنگیتا نے اس کے ساتھ جا کر وہ گھر دیکھا یہ بھی دو کمروں کا گھر تھا جس میں تین لڑکے رہ رہے تھے۔ مگر ان لڑکوں نے کہا کہ سنگیتا کو وہ علیحدہ ایک کمرہ دے دیں گے۔ دوسرے کمرے میں دو لڑکے اور ایک لڑکا گھر کے ہال میں رہ لے گا۔ گھر معقول تھا کالج کے قریب بھی تھا اور چار لوگوں پر تقسیم ہو کر کرایہ بھی کم ہو گیا تھا۔

سنگیتا ان کے ساتھ شفٹ ہو گئی۔ اب وہ سکون سے کالج جاتی۔ ہفتے میں تین دن کام کرتی۔ اس کے گھر میں رہنے والے لڑکے جو انڈیا کے مختلف شہروں سے تھے آدیتہ، راج اور شنکر مل کر گھر کے

کام بھی کر لیتے ایک کھانا بناتا دوسرا کپڑے دھوتا اور تیسرا صفائی کر لیتا۔
سنگیتا گویا اپنے ہی گھر میں رہ رہی تھی انڈیا جیسا ماحول تھا۔ اب وہ خوش تھی۔ اپنی مرضی کے شارٹ سکرٹ پہنتی جیسا دیس ویسا بھیس۔ ہر ویک اینڈ پر ان کے ساتھ پب بھی جاتی۔ اس نے بیئر اور وسکی پینی بھی شروع کر دی تھی۔
تینوں لڑکے اس کا بہت خیال رکھتے وہ چار دوستوں کی طرح ہنستے، گاتے، ناچتے اور اپنے اپنے کمروں میں جا کر سو جاتے آٹھ مہینے ایسے ہی گزر گئے نیا سال شروع ہونے والا تھا۔ سب نے نئے سال کے استقبال کی تیاری شروع کر دی نئے برانڈز کے جوتے اور جیکٹیں خریدیں سنگیتا نے کالے رنگ کی لیگنگ کے ساتھ سفید رنگ کی شارٹس سفید جیکٹ اور چمکیلے اونچی ایڑی کے جوتے خریدے۔
لندن آئی سے ہونے والی آتش بازی دیکھنے اور نئے سال کو خوش آمدید کہنے کے لیے بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔
آخر سال کا آخری دن آ ہی گیا سب نے تیار ہو کر مہنگے والے پرفیوم لگائے اور 31 دسمبر چار بجے دن ہی لندن کے لیمبرتھ برج پہنچ گئے ان سے پہلے ہی برج پر لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو چکا تھا۔ جو دور دراز سے رات بارہ بجے ہونے والی آتش بازی دیکھنے اور پرانے سال کو الوداع کہنے آئے تھے۔ کچھ لوگ اپنے کمبل اور کھانے پینے کی اشیاء اور شراب کی بوتلیں بھی لے کر برج کے فرش پر قبضہ جمائے بیٹھے تھے۔
سردی انتہا کی تھی جو گرم جیکٹوں کے باوجود جسموں میں سرایت کر رہی تھی آدیتہ، راج اور شنکر نے بھی راستے سے کھانے پینے کا سامان خرید لیا تھا جس میں شراب کی بوتلیں بھی تھیں۔
برج پر کھڑے ہوئے جب وہ تھک گئے تو فرش پر بیٹھ کر اپنے اپنے موبائلوں پر گیمز کھیلنے لگے۔ انتظار کی گھڑیاں طویل ہوتی ہیں وقت گزرنے میں نہیں آ رہا تھا۔ رات کے نو بجے سب نے مل کر کھانا کھایا اور پھر شراب کی بوتلیں کھول لیں۔
سنگیتا جو سردی سے ٹھٹھر رہی تھی اس نے بوتل کو منہ لگایا اور ایک سانس میں ہی پی گئی۔ اب اس کا جسم حرارت محسوس کر رہا تھا۔ مگر اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے آدیتہ نے اس کو سہارا دیا تو وہ اس کے ساتھ لپٹ گئی۔
ٹھیک بارہ بجے لندن آئی سے رنگین شعلے ابھرنے شروع ہوئے ساری فضا اور ٹیمز کا پانی روشنیوں سے بھر گیا۔ لوگ خوشی سے چیخنے لگے ویڈیوز بنانے لگے یہ سحر انگیز نظارہ بیس منٹ تک جاری رہا۔ سب لوگ اپنے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ کچھ پیدل کچھ ٹرین پر کچھ اپنی گاڑیوں میں سر شام بند ہونے والے راستے کھول دیے گئے تھے۔
آدیتہ، راج اور شنکر لڑکھڑاتی ہوئی سنگیتا کو سہارا دے کر گھر تک لائے، اسے اپنی سدھ بدھ نہیں تھی۔ جب نئے سال کی صبح ہوئی تو وہ تینوں سنگیتا کے ساتھ نیا سال منا چکے تھے۔

☆☆☆☆☆

''ترجمہ ایک افسانے کا''

یہ ایک دوسری زبان کے ادب کا افسانہ ہے۔ اسے ترجمہ کرنے میں کچھ دشواری تو پیش نہیں آئی، البتہ نامانوس زبان کے ایک غیر منکشف ادیب کا ترجمہ قدرے ریاضت تو مانگتا ہے، اور اس میں بھی ایسا ہی ہوا۔

اس افسانے کا خلاصہ یہ ہے کہ اس میں مترجم کو یہ آزادی حاصل ہے کہ ایک کردار جسے آدھے دن کی عورت، کہا گیا تھا، اسے آدھی رات کی عورت کے طور پر نمایاں کر سکے۔

اس کے علاوہ مترجم کو یہ سہولت بھی فراہم کی گئی ہے کہ وہ کم سے کم الفاظ میں آدھے دن کے مرد کو نصف شب کا اندھا آدمی کہہ سکے۔

متن کے بین السطور نے یہ عقدہ بھی کھول دیا ہے کہ اندھے آدمی کو دوپہر کا انسان بھی تصور کیا جا سکتا تھا۔

گویا اس تصور کے ساتھ بھی افسانے کو آگے بڑھایا جا سکتا تھا۔

خیر جہاں تک جبری چھٹی پر بھیجے جانے کا سوال ہے، اسے احقر خندہ پیشانی سے تسلیم کرنے کا پابند نہیں تھا۔

یہ تو تھیں ابتدائی تعارف کی باتیں، اصل مسئلہ تو افسانے کی روح کے ترجمے کا تھا۔

وہاں پر مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ روح کی بات تو افسانے نے کبھی بتائی ہی نہیں تھی۔ اس سے یہ اندازہ ہوا کہ افسانہ اور اس کے کردار اور الفاظ، پیش ہونے سے قبل ہی خود کو پابند کر لیا کرتے تھے کہ بس عمومیت ہی کو خصوصیت حاصل ہوگی، کیوں کہ اس کا سامنے آنا ہی بہت بڑی ذہانت ہے، روح تک جانا کار لاحاصل ہوگا۔

مترجم کو اس بات کا پابند کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسے نامعلوم مصنف کے اُس غیر تحریر شدہ مواد کا دھیان بھی رکھنا ہوگا، جو کبھی اس تحریر کا ناگزیر حصہ بننے کے درپے تھا، مگر لاعلمی نے عملی طور پر ایسا نہ ہونے دیا۔ دوسرے لفظوں میں ان کہی گفتگو کا کچھ لحاظ رکھنا بھی ضروری تھا۔

زیب اذکار حسین

کہانی کا یہ قصہ دراصل، افسانے کے ظہور پذیر ہونے سے قبل کا ہے۔

اب آیئے اس ریلوے سٹیشن کی طرف، جہاں پر وہ آدھے دن کی عورت عجلت میں آئی تھی اور ایک ٹرین کی آمد کا انتظار کرتی رہی تھی۔ اس سٹیشن کا نام سرکاری بہی کھاتوں میں ہنوز 'ہیلو ہائے' تھا، جبکہ سات ماہ قبل اس کا نام تبدیل کر دیا گیا تھا۔ اب اس کا سرکاری نام 'بائے، بائے ریلوے سٹیشن' تھا۔ اس کا نام بھی بہت عجلت میں تبدیل کیا گیا تھا۔

اس عجلت کی کبھی کوئی وضاحت سامنے نہ آ سکی تھی، بس اس ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر نصب ایک نوٹس بورڈ پر ایک کاغذ چپکا دیا گیا تھا، جس پر قدرے جلی حروف میں 'بائے بائے ریلوے سٹیشن' لکھا تھا۔

کسی کو اس آدھے دن کی عورت سے یہ پوچھنے کی فرصت ہی نہیں تھی کہ آخر وہ کیوں ایک لایعنی سرگرمی کے انجام کا کھیل کھیلنے پر بضد تھی؟

تحقیق نے ثابت کیا کہ چند قدم کے فاصلے پر آدھی رات کے آدمی کا مکان تھا، وہ چاہتی تو پیدل چل کر وہاں جا سکتی تھی، مگر اسے تو شاید اسی مکان سے دور جانے کی پڑی تھی۔

دوسری طرف وہ آدھے دن کا مرد، اپنی رات کی کھوج میں مارا مارا پھر رہا تھا۔

اس کی بھاشا ایسی بدیشی بھی نہ تھی کہ کسی کی سمجھ میں نہ آتی۔ وہ شاید ایک ایسی نہ بولے جانے والی بولی کی بددعا کا شکار ہو گیا تھا، جو اتفاق کی بے برکتی سے پیدا ہوئی تھی۔

اس کے خلاف خاموشی کی وہ زبان اپنا لی گئی تھی جو کتابوں میں کہیں درج نہیں تھی۔

یہ مٹ جانے والی زبان ایاک تھی اور نہ ہی ایاپینکو جیسی کوئی زبان کہ جس نے کچھ عرصہ قبل ہی رخصت لینے کی ٹھانی تھی۔

اس روز مجھے یوں لگا، جیسے میں اپنے دوست کو ایک نئے روپ میں دیکھ رہا ہوں۔ وہ ایک دکان سے کچھ خرید رہا تھا، بڑھے ہوئے شیو کے ساتھ۔

اس بڑھے ہوئے شیو کو بالشت بھر کی ریش کہا جا سکتا ہے، میں نے سوچا، مگر دوسرے ہی لمحے میں چونک گیا، کیا میں اس سطح تک آ چکا ہوں؟

دوست پر نظر پڑی تو بے ساختہ بڑبڑایا یہ تو معمولی سا بڑھا ہوا شیو ہے، اسے ایک باقاعدہ باریش شخص نہیں کہا جا سکتا ہے۔

اس کی داڑھی خاصی بے ترتیب سی لگ رہی تھی، جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ باقاعدہ، قاعدے کی ریش نہیں ہے، بلکہ اپنی ذات سے بے گانگی اور لاپرواہی کا نتیجہ ہو سکتی ہے۔

وہ اس دکان سے کچھ خرید رہا تھا۔ اس دکان یا سٹور کے باہر جہاں ربڑ کی تاروں پر

کاروں اور رکشوں کے ڈھیروں ٹائر ٹنگے ہوئے تھے، ایسا لگا جیسے یہ ٹائروں کی دکان ہے۔

میں چلتے چلتے رک گیا تھا۔ اسے بھی جیسے احساس ہو گیا تھا کہ کوئی اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اس نے ایک نگاہ غلط مجھ پر ڈالی اور پھر تیزی سے دکان سے باہر نکلا اور دائیں ہاتھ کی بغلی گلی میں مڑ گیا۔

میں قدرے حیران ہوا کہ وہ ٹائروں کی دکان میں کیا کرتا پھر رہا ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ جیسے غائب بھی ہو گیا تھا۔

میں اسے آواز دیتا رہ گیا۔

''اخاہ ارے حضرت ذرا ٹھہریئے تو---

مجھے جناب سے ضروری بات ---''

میرا جملہ ادھورا رہ گیا،

وہ رکے بغیر چلتا رہا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے غائب بھی ہو گیا تھا۔

پھر ایک اجنبی آواز نے مجھ سے کہا

''ان صاحب سے بات کرنا فضول ہے، یہ اپنے حواسوں میں نہیں ہیں''

کیا مطلب، یہ اپنے ہوش گنوا چکے ہیں؟

میں نے استفسار کیا

''نہیں، ان کا مسئلہ زباں فراموشی ہے، کہتے ہیں وہ زباں فروشی سے زیادہ زباں فراموشی کو اہم سمجھتے ہیں۔''

ان کی رہائش کہاں ہے؟ میں نے بے تابی سے پوچھا۔ یوں لگا آواز میری بے تابی کو بھانپ چکی ہے اور مدھم لہجے میں جیسے منمنا رہی ہے۔

''کبھی اس گلی میں اور کبھی کسی اور گلی میں، کبھی کسی شہر میں، بلکہ ملک میں، تو کبھی کہیں۔ ایسے بے حواسوں کا ایک ٹھکانہ تو ہوتا نہیں ہے۔''

آواز اب جیسے ایک بے ہنگم سے شور میں دبتی جا رہی تھی - اسے شاید ایئر پورٹ پہنچنا تھا۔

اسے خدشہ تھا کہ اسے دیر ہو سکتی ہے اور اس کی فلائٹ، مس ہو سکتی ہے۔

اجنبی آواز اب دور جا چکی تھی۔ آواز کی محرک شخصیت ایک بھاری بھرکم لمبے سے کوٹ نما خول میں بند تھی۔ یہ عجیب سا لباس لگا مجھے، اوپر سے چہرہ بھی زرد رنگ کے ماسک سے ڈھکا ہوا تھا۔ یہ بات واضح نہ ہو سکی تھی کہ یہ آواز کسی مرد کی ہے، خاتون کی ہے یا کسی خواجہ سرا کی ہے۔

آواز اب بہت دور جا چکی تھی ---

افسانے کے ترجمے کی بات تو ادھوری ہی رہ گئی تھی، کیوں کہ سامنے کی ایک آواز کا بھی ٹھیک طرح سے ترجمہ نہ ہو سکا تھا۔

افسانہ ہنوز نامکمل تھا، اس کے کردار یا تو ریلوے سٹیشن پر تھے، یا ہوائی اڈے کی طرف رواں دواں تھے، اور یا پھر خامشی کا روپ دھار چکے تھے۔

☆☆☆☆☆

خونچکاں محبت

رات کی تاریکی میں، جب شہر کے گلی کوچے سُنسان ہو چکے تھے، زریاب اپنی دھندلی سی کھڑکی کے پاس بیٹھا سگریٹ کا دھواں ہوا میں اڑاتے ہوئے کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک اور چہرے پر پُر اسرار مسکراہٹ تھی۔ چند لمحوں بعد، دروازے پر دھیرے سے دستک ہوئی۔ وہ اٹھا اور دروازہ کھولا؛ سامنے مہرین کھڑی تھی، اس کی محبوبہ۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی جو زریاب کو ہمیشہ متوجہ کرتی تھی۔

''تم نے مجھے اس وقت کیوں بلایا؟'' مہرین نے حیرت بھری نگاہوں سے پوچھا۔

زریاب نے مسکراتے ہوئے کہا، ''تمھیں کچھ خاص دکھانا ہے، کچھ جو تمھیں میری حقیقت سے روشناس کروائے گا۔''

مہرین نے اسے غور سے دیکھا، مگر کچھ نہ بولی۔ زریاب نے اسے اپنے کمرے میں آنے کا اشارہ کیا۔

کمرے کے ایک کونے میں، میز پر ایک سفید کپڑا پڑا ہوا تھا۔ زریاب نے کپڑا ہٹایا تو مہرین کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہاں ایک پلیٹ میں گوشت کے ٹکڑے پڑے تھے، مگر وہ عام گوشت نہیں تھا۔ مہرین نے دھیرے سے کہا، ''یہ کیا ہے؟''

زریاب نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کہا، ''یہ انسانی گوشت ہے۔''

مہرین کے چہرے پر دہشت کے سائے لہرانے لگے۔ ''تم پاگل ہو گئے ہو؟ یہ کیا کہہ رہے ہو؟''

زریاب نے نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑا۔ ''ڈرو مت۔ یہ صرف ایک تجربہ ہے۔ انسان اور جانور میں کیا فرق ہے؟ جیسے ہم جانور کا گوشت کھاتے ہیں، یہ بھی گوشت ہی ہے ہاں بس فرق یہ ہے کہ ''معاشرتی حیوان'' کا ہے۔ یقین جانو ذائقہ اس سے بھی لذیذ ہے، ایک بار چکھ کر دیکھو۔''

مہرین نے پیچھے ہٹنا چاہا، مگر زریاب کی نگاہوں میں کچھ ایسا تھا جو اسے روکنے پر مجبور کر رہا تھا۔ ''یہ سب غلط ہے...'' وہ بس اتنا ہی کہہ پائی۔

''محبت کے لیے انسان تو کچھ بھی کر جاتا ہے یہ تو محض گوشت چکھنا ہے۔''

اگر تم مجھ سے محبت کرتی ہو، تو یہ معمولی سا تجربہ ہمارے رشتے کو مضبوط کرے گا۔''

کچھ لمحے کی کشمکش کے بعد، مہرین نے جذباتی ہو کر ایک چھوٹا سا ٹکڑا اٹھایا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے، مگر زریاب کی نظروں کے دباؤ نے اسے مجبور کر دیا۔ وہ آنکھیں بند کر کے ٹکڑا چبانے لگی۔ محبت کا بھرم رکھنے کے لیے

عمار نعیمی

اس نے یہ انتہائی قدم تو اٹھایا لیکن فوراً اس کا دل گھبرایا اور اس نے قے کر دی۔
وہ تھوڑی دیر کے لیے ساکت ہو گئی۔ اس کی زبان پر کچھ لمحوں کے لیے ایک بے نام سا ذائقہ رچ بس گیا، جو نہ تو خوشگوار تھا نہ مکمل ناپسندیدہ۔
''کیا تم ٹھیک ہو؟'' زریاب نے دھیرے سے پوچھا۔
مہرین نے بمشکل سر ہلایا۔ ''یہ..... بہت عجیب تھا۔''
زریاب نے مسکراتے ہوئے کہا، ''ہر پہلی چیز عجیب ہی لگتی ہے۔ لیکن دیکھو، تم نے یہ کر لیا۔''
مہرین نے کچھ نہ کہا، بس خاموشی سے گلے لگا لیا۔ اس کے دل میں ایک عجیب سی کشمکش چل رہی تھی۔ کیا یہ محبت کا امتحان تھا یا کوئی شیطانی کھیل؟
اگلے دن مہرین مسلسل بے چین رہی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ اس رات کو بھول جائے، مگر اس کے ذہن میں گوشت کا ذائقہ بار بار ابھر رہا تھا۔ اسے خود پر غصہ آ رہا تھا کہ اس نے وہ چیز چکھی کیوں؟ مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ اس ذائقے کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کے جسم میں ایک عجیب سی لذت کی لہر دوڑ جاتی تھی۔
کئی دنوں تک اس نے زریاب سے ملنے سے گریز کیا۔ مگر زریاب نے ایک دن اسے فون کیا اور اسے ڈنر پر مدعو کیا۔ مہرین نے ہچکچاتے ہوئے ہاں کہہ دیا۔
جب وہ اس کے گھر پہنچی تو زریاب نے پہلے سے ہی کھانے کا انتظام کر رکھا تھا۔ میز پر وہی گوشت رکھا ہوا تھا، مگر مہرین کا دل اب پہلے جیسا بے چین نہ تھا۔ اس کے اندر ایک نیا تجسس جاگا تھا۔
''اگر تم چاہو تو یہ آخری بار ہو سکتا ہے،'' زریاب نے کہا۔
مہرین نے پلیٹ کی طرف دیکھا، زریاب نے اپنے ہاتھوں سے اس کو کھلایا۔ اس بار اسے نہ صرف کھانے میں آسانی ہوئی بل کہ اس نے ذائقے کو محسوس کرنا شروع کر دیا۔ گویا اس کی زبان اب اس کی مزاحمت چھوڑ چکی تھی۔
رفتہ رفتہ، مہرین کو اس گوشت کے لیے اپنی طلب کا احساس ہونے لگا۔ یہ طلب نہ صرف زریاب کے ساتھ اس کے رشتے کو مضبوط کر رہی تھی بلکہ اس کے اپنے اندر بھی ایک عجیب سی تبدیلی لا رہی تھی۔ اب وہ زریاب کے ساتھ زیادہ وقت گزارنا چاہتی تھی، اور وہ دونوں مل کر نئے تجربے کرنے لگے۔
ایک دن مہرین نے زریاب سے پوچھا، ''تم نے یہ سب کب اور کیسے شروع کیا؟''
زریاب نے جواب دیا، ''یہ ایک حادثہ تھا، مہرین۔ مگر اس نے مجھے میری حقیقت سے روشناس کرایا۔ اور اب، یہ تمہاری بھی حقیقت ہے۔''
وقت گزرنے کے ساتھ، مہرین کو احساس ہونے لگا کہ وہ اس ذائقے کی عادی ہو رہی ہے۔ زریاب نے اسے مزید گوشت فراہم کرنا شروع کر دیا۔ زریاب وہ گدھ بن گیا تھا وہ

مردار کھاتا ہے لیکن یہ گدھ اپنی مادہ کا بھی احساس کرتا تھا۔ مہرین نے سوال کرنا چھوڑ دیا، وہ صرف زریاب کی محبت میں گرفتار تھی۔

مگر اس کا اندرونی سکون ختم ہونے لگا۔ ایک رات، جب وہ آئینے کے سامنے کھڑی تھی، اسے لگا کہ اس کی آنکھوں میں وہی وحشت نظر آ رہی ہے جو کبھی زریاب کی آنکھوں میں ہوتی تھی۔ ''کیا میں بھی وہی بن رہی ہوں؟''

یہ سوال اسے ہر رات بے چین کر دیتا۔

ایک دن، مہرین نے زریاب سے کہا، ''مجھے تمہارے ساتھ شکار پر جانا ہے۔''

زریاب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، ''شکار پر؟ تم واقعی تیار ہو؟''

''ہاں، مجھے یہ دیکھنا ہے کہ تم یہ سب کیسے کرتے ہو۔''

اگلی رات، زریاب اور مہرین ایک سنسان علاقے میں گئے۔ وہاں ایک لاوارث شخص کو دیکھ کر زریاب نے چاقو نکالا اور مہرین کی طرف بڑھایا۔ ''یہ تمہارا امتحان ہے۔''

مہرین کی سانسیں تیز ہو گئیں۔ مگر اس نے چاقو لے لیا اور زریاب کے اشارے پر عمل کیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب مہرین نے خود کسی کو نقصان پہنچایا۔ مہرین وہ شیر بن چکی تھی جو تازہ گوشت کھانا پسند کرتا ہے نہ کہ گدھ کی مانند مردہ گوشت۔ اس شکار میں زریاب نے مہرین کی مدد کی۔

اب دونوں مل کر شکار کرتے اور ایک دوسرے کے ساتھ انسانی گوشت کھاتے۔ ان کے درمیان محبت کا رشتہ مزید گہرا ہو گیا تھا، مگر یہ محبت اب ایک خطرناک جنون میں بدل چکی تھی۔

ایک دن، مہرین نے زریاب سے کہا، ''کیا تم نے کبھی سوچا کہ ہم آخر کب تک یہ کرتے رہیں گے؟''

زریاب نے ہنستے ہوئے جواب دیا، ''جب تک ہم زندہ ہیں، مہرین۔ یہ ہمارا راز ہے، ہماری دنیا۔''

مگر مہرین کے دل میں ایک عجیب سی بے چینی نے جنم لینا شروع کر دیا تھا۔

ایک رات، مہرین نے زریاب کو کھانے پر مدعو کیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح خوش تھا، گویا آج رات کچھ خاص ہونے والا ہو۔ مہرین نے کہا، ''آج کا کھانا میں نے خاص طور پر تمہارے لیے تیار کیا ہے۔ یہ ہماری محبت کا جشن ہے۔''

زریاب نے مسکراتے ہوئے کہا، ''میں جانتا ہوں، تم جو بھی بناؤ گی، لاجواب ہوگا۔''

مہرین نے ایک خوب صورت سی میز سجائی اور کھانے کی پلیٹ سامنے رکھی۔ زریاب نے پہلا لقمہ لیا اور ذائقہ محسوس کرتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ ''یہ واقعی لاجواب ہے۔ تم نے کیا بنایا ہے؟''

مہرین نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، ''یہ بھی انسانی گوشت ہے، مگر ذرا خاص ہے۔''

زریاب نے حیرت سے سر اٹھایا، ''خاص؟ کیا مطلب؟''

مہرین نے آرام سے کہا، ''یہ میرا اپنا گوشت ہے۔''

زریاب کا چہرا حیرت اور بے یقینی میں ڈوب

گیا۔ ''کیا؟ تم نے اپنا گوشت کیسے کاٹا؟''
مہرین نے اپنی قمیض کا بازو اوپر کیا۔ اس کے بازو پر ایک گہرا زخم تھا جسے بڑی مہارت سے پٹیوں میں لپیٹا ہوا تھا۔
''میں نے ایک رات اپنے بازو کو انجیکشن لگا کر سُن کیا، چھری اٹھائی اور اپنے بازو سے گوشت کا ایک ٹکڑا کاٹ لیا۔ درد ناقابلِ برداشت تھا، مگر محبت میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا، زریاب۔ میں تمہیں وہ چیز دینا چاہتی تھی جو تم نے مجھے دی — ایک غیر معمولی تجربہ۔''
زریاب نے بے یقینی سے اسے دیکھا، پھر اپنی پلیٹ کو۔ اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ قے کرنے کے بعد وہ بولا: ''تم نے..... یہ سب کیوں کیا؟''
مہرین نے نرمی سے کہا، ''کیونکہ میں جاننا چاہتی تھی کہ محبت میں قربانی کی آخری حد کیا ہے۔ تم نے مجھے یہ سکھایا، اور اب میں نے وہی تمہیں لوٹا دیا۔''
زریاب نے پلیٹ کو ایک طرف رکھ دیا، اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''تم نے واقعی یہ سب میرے لیے کیا؟''
مہرین نے مسکراتے ہوئے کہا، ''ہاں، زریاب۔ محبت صرف لینے کا نام نہیں، یہ دینے کا بھی نام ہے، چاہے وہ اپنی ذات کا ایک حصہ ہی کیوں نہ ہو۔''
زریاب کچھ دیر خاموش رہا، پھر آہستہ سے گوشت کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک اور لقمہ لیا، اور اس کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔
''تم نے ثابت کر دیا کہ تم مجھ سے بھی زیادہ مضبوط ہو، مہرین۔ مگر میں یہ محبت نہیں قبول کر سکتا۔ یہ رشتہ اب صرف جنون بن چکا ہے۔''
مہرین نے سرد لہجے میں کہا، ''جنون اور محبت کے درمیان کبھی کوئی فرق تھا ہی نہیں، زریاب۔ ہم دونوں اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے۔''
زریاب نے کچھ لمحوں کے لیے مہرین کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف، حیرت، اور ایک عجیب سی قبولیت جھلک رہی تھی۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھا، پلیٹ کو ایک طرف رکھ دیا، اور دھیرے دھیرے مہرین کے قریب آیا۔
''تم ٹھیک کہتی ہو، مہرین۔ محبت اور جنون ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ مگر شاید میں اس جنون کے ساتھ مزید نہیں جی سکتا۔''
مہرین نے اس کی بات سن کر نظریں جھکا لیں۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے عمل نے ان کے رشتے میں ایک ناقابلِ تلافی دراڑ ڈال دی ہے۔ زریاب نے میز پر رکھا چاقو اٹھایا، مہرین کے زخم زدہ بازو کی طرف دیکھا، اور دھیرے سے کہا، ''شاید تم نے اپنی محبت ثابت کر دی ہو۔ لیکن میں نے تمہیں یہ راہ دکھا کر اپنی زندگی کا سب سے بڑا گناہ کیا''
زریاب نے ایک قدم پیچھے ہٹایا اور اپنی گردن کو چاقو سے کاٹ لیا اور بے دم ہو گیا۔ مہرین بے حس و حرکت کھڑی رہی اور کچھ سیکنڈز بعد جب مہرین کے حواس بحال ہوئے تو وہ باورچی خانے کی طرف دیکھنے لگی۔

☆☆☆☆☆

اصل قلم کار کی فریاد!

کل شام اسے ایک فائیو سٹار ہوٹل میں دیکھا الگ ہی ٹھسکہ تھا برینڈڈ پینٹ شرٹ، مہنگی شوخ ٹائی، شرٹ پر بٹن کی جگہ چمچماتے سٹڈ، برینڈ نیو جوتے، آنکھوں پر ٹکے قدرے مہنگے گوگلز، ٹانگ پر ٹانگ قدرے بے نیازی اور مکمل ٹورپنے کے ساتھ چائے پی جا رہی تھی ہم سب دوست حیرت کے عالم میں اسے دیکھ رہے تھے یہ ہمارا وہی یونی ورسٹی فیلو تھا جو گزشتہ کئی برس سے پاکستان کے اکثر نوجوانوں کی طرح اپنی 18 سالہ ڈگریاں تھامے بے روزگاری کی چکی میں پس رہا تھا۔۔

وہ ہماری یونی ورسٹی کا ذہین ترین اور باصلاحیت طالبعلم مانا جاتا تھا اسے لکھنے کا ہنر ودیعت خداوندی تھا شاعر بھی خوب تھا وہ جیسے ہی لکھتا یا اپنا کچھ لکھا ہوا سناتا تو پڑھنے، سننے والوں کی روح میں اتر جایا کرتا الفاظ میں تاثیر بھی بلا کی تھی۔ ابھی ہم سب اس سے ملنے یا نہ ملنے کی کشمکش میں ہی مبتلا تھے کہ وہ اپنی نشست سے اٹھا اور خود ہمارے پاس چلا آیا کرسی کھینچی اس کا رخ ہماری ٹیبل کی جانب موڑ دیا اور بیٹھ گیا اس کے انداز میں بلا کی رعونت تھی دیکھنے والا پہلی نظر میں پہچان سکتا تھا کہ یہ رعونت نئی نئی ہے خیر سب نے ایک دوسرے کے احوال دریافت کیے اور یونیورسٹی کے خوب صورت اور یادگار دور کے واقعات تازہ کیے جانے لگیں۔

بات چل نکلی تو ایک دوست نے چھوٹتے ہی پوچھ لیا کہ تم تو جاب نہ ملنے کے سبب زندگی سے، اس نظام سے قدرے بیزار تھے پھر اچانک سے یہ بدلاؤ؟ کیا کسی بہت اچھے سسٹم میں پوسٹنگ ہوگئی ہے جس پر وہ زیرلب مسکرایا اور شرارتی انداز میں بولا کہ دراصل میں نے چند ضرورت مندوں کی نوکری کر لی ہے۔

فاطمہ رداغوری

ضرورتمندوں کے یہاں کس کام پر مامور ہو گئے ہو جو بچارہ خود ضرورت مند ہے وہ تمہیں کیا دے گا بات کچھ سمجھ نہیں آئی؟ ہم نے استفسار کیا تو اس کے جواب نے ہمیں مزید متذبذب کر دیا کہنے لگا کہ وہ لوگ جنہیں خدا نے بہت سے وسائل سے نواز رکھا ہے لیکن انہیں کچھ لکھ پانے کی صلاحیت نہیں دی وہ لکھنا چاہتے ہیں اور شہرت حاصل کرنا چاہتے ہیں دنیائے علم و ادب میں نام پیدا کرنا چاہتے ہیں میں انکی ضرورت پوری کرتا ہوں اور ان کے من پسند مطلوبہ موضوعات قلمبند کرتا ہوں جس کے عوض وہ اچھی خاصی رقوم اور انعام و اکرام سے نواز دیتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے زندگی گلزار ہے۔

وہ تمھارے لکھے ہوئے کو کرتے کیا ہیں ایک اور دوست نے اگلا سوال داغ دیا۔

وہ تحریریں کالم کی صورت کئی موقر جرائد میں شائع ہوتی ہیں یہاں مجھے لکھنے کی اجرت دی جاتی ہے اور وہاں کسی کو شائع کرنے کے لیے معاوضہ دیا جاتا ہے اور یوں یہ پراسرار شخصیات کالم نگار، مصنف، نقاد، شاعر، افسانہ نویس اور نجانے کیا کیا کہلاتے ہیں۔

پہلے پہل میں نے دکھ کی کیفیت میں ضرورت کے پیش نظر اس کام کا آغاز کیا۔۔ ہر وقت ضمیر ملامت کرتا تھا کہ کچھ غلط کر رہا ہوں، قلم بیچ رہا ہوں، ہنر بیچ رہا ہوں ایک خوف سا رہتا تھا کہ میں کچھ غیر قانونی کر رہا ہوں کسی کو معلوم ہو گیا کہ یہاں یہ کام چل رہا ہے تو نجانے کیا ہو گا لیکن دھیرے معلوم ہوا کہ اس کام کی تو پوری مارکیٹ ہے یہ ایک مکمل بزنس ہے اگر آپکا کام پسند آ جائے تو کلائینٹس میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے جتنی ہمت اللہ دے کام پکڑتے جاؤ اور پیسے کماتے جاؤ۔۔۔

وہ تھوڑی دیر رکا اور پھر ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ دوبارہ گویا ہوا میرے پاس اس وقت مختلف نوعیت کے کام ہیں وہ لوگ الگ ہیں جو کتاب لکھوا رہے ہیں، بھاری معاوضہ دے کر اشعار خریدنے والے الگ ہیں پی ایچ ڈی ڈاکٹرز کے مقالے لکھنے کی بھی ایک الگ ہی داستان ہے، ترقی ملنے کی خبروں کے ساتھ ہی گریڈ بڑھنے کے خواہشمند پروفیسرز کے لکھے جانے والے ریسرچ پیپرز کی ایک علیحدہ فہرست ہے بڑے بڑے سرکاری مشاعروں کے اعلان کے ساتھ نئی غزلیں لکھوانے والے الگ اور سرکاری ایوارڈز کے اعلانات کے ساتھ ہی ادبی خدمات میں فی الفور اضافہ کرنے والوں کی بھی ایک الگ ہی کہانی ہے ان کے پاس وسائل ہیں وہ ہر طرف پیسے بانٹتے پھرتے ہیں اور شہرت، نام سب خرید لیتے ہیں۔۔ پیسے سے عزت نہیں مل سکتی جیسے مقولے تو عرصہ ہوا دم توڑ چکے۔۔ حقیقت

ہے کہ ماضی کے بیشتر محاورات، مقولوں اور اقوال زریں کی تہہ میں جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تو حقیقت سے تعلق ہی نہیں تھا---

اب کہ تو ہم بھی ششدر رہ گئے جسم ایسے ساکت جیسے کاٹو تو لہو نہیں ہم سب دم سادھے اسکی باتیں سن رہے تھے اور وہ ایسے بے تکان بول رہا تھا جیسے عرصے سے کسی کو ڈھونڈ رہا ہو جسے دل کی بات کہہ سکے--- اسکی رعونت اور تفاخر نجانے کہاں ہوا ہو گئے اور انکی جگہ مظلومیت، بے بسی، بے چارگی اور ضرورتمندی نے لے لی-- سب دیکھ سکتے تھے کہ اسکے دل پر ایک بوجھ ہے جسے اس پر عائد پورے خاندان کی ذمے داریوں کے بوجھ نے پس پشت ڈال رکھا ہے--

ہمارا ذہن سوال کرنے لگا آخر ہم کس سمت جا رہے ہیں سفارش اور رشوت کے بل بوتے پر نوکری حاصل کرنا، پیسے کے زور پر ضرورتمند مجبور عوام کے ووٹ خرید کر آگے بڑھنا زندگی سے بیزار عوام کی بھوک خرید کر جلسے جلوسوں کے افراد میں اضافہ کر لینا یہ اور اس طرح کی بہت سی باتیں دیکھ سن رکھی تھیں لیکن جو آج سن رہے تھے وہ ہمارے لیے ایک دم نیا تھا--- جن جن کو ہم پڑھتے ہیں، پسند کرتے ہیں جن کی شاعری ہمارے روح و قلب کے لئے تسکین کی باعث ہے، جن کے افسانے ہمیں بیٹھے بٹھائے کسی اور جہاں میں لے جانے کی طاقت رکھتے ہیں--- جن کے تحقیقی کاموں سے ہم متاثر ہیں کیا ان میں سے کوئی اس فہرست میں شامل تو نہیں؟؟ کیا وہ محبت وہ عقیدت سامنے بیٹھے اس مجبور انسان کے ساتھ ہونی چاہیئے کیا یہ اصل حقدار ہے؟؟ نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا وہ سب بڑے بڑے باشعور نام ہیں اور ایک صاحب شعور انسان ایسا کام کر ہی نہیں سکتا-- ذہن عجیب و غریب تانے بانے بننے لگا ادبی علمی خدمات پر سرکاری ایوارڈ یافتہ افراد آنکھوں میں گھومنے لگے خدا خیر کرے!!! ہر کوئی درجنوں کتابوں کا مصنف ہے کوئی کسی کو جعلی شاعر کہہ رہا ہے کوئی کسی کے ایوارڈ یافتہ ہو جانے پر غیر مطمئن ہے ایک دوسرے پر مسلسل کیچڑ اچھالا جا رہا ہے ہر کوئی عیب اور نقائص تلاشنے کی عینک لگائے بیٹھا ہے

یہاں پگڑی اچھلتی ہے اسے میخانہ کہتے ہیں

.....

کے مصداق کوئی ادیبوں کے حلقے کو' ہلکا'' کہہ رہا ہے کوئی دو نمبر شاعروں کے شہرت یافتہ ہو جانے پر نوحہ کناں ہے ہر کوئی اپنی نگاہ میں بذات خود معتبر ترین ہے-

ہم ابھی یہ سوچ ہی رہے تھے کہ موبائل کی بیل بجی، اس نے گفتگو روک دی اور ہم سے معذرت کرنے کے بعد موبائل پر کسی نئے ضرورت مند سے ڈیل کرنے لگا-

☆☆☆☆☆

خوف سستی اور بھوک کی تثلیث

ہم نے بڑے بڑے ---- دیکھے ہیں مگر ان سا آج تک نہیں دیکھا ویسے تو ہمارا پیارا ملک نمونوں سے بھرا ہوا ہے اس لیے اس میں اچنبے کی بات نہیں کہ ایک اور سہی۔ وہ ہمارے محکمے کے سربراہ کے طور پر تعینات ہو کر تشریف لائے تھے گورا رنگ بھاری بھرکم جسم گھنگھریالے بال انکھیں چھوٹی چھوٹی ماتھا چوڑا ناک مناسب لیے ہوئے ہم کو ہمیشہ وہ بیٹھے ہوئے ہی ملے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ بھائی صاحب کا تعلق پٹھان قوم سے ہے لیکن ہم کو یقین نہیں اتا کیونکہ ان کی عادات اور جسم کی ڈیل ڈھول بتاتی ہے کہ وہ بٹ ہیں اندر کے مخبر کے مطابق وہ دفتر میں سات سے 10 گلاس ملک شیک کے پیتے ہیں کافی چائے بسکٹ پیٹیز اور کھانا بھی چکھ لیتے ہیں ایک دفعہ ایک دفعہ گھر سے تشریف لائے تو اتے ہی ملک شیک مانگ لیا جب تین گلاس ملک شیک پی لیے طبیعت خراب ہوگئی اور الٹی آنے لگی وہ حیران تھے کہ اج کیا ہوا وہ روزانہ ملک شیک سے ہی دن کا اغاز کرتے ہیں تو آج کیا ہوا بہرحال گھر جانا پڑا تا کہ ارام کر سکے اور پھر تازہ دم ہو کر ملک شیک پی سکیں بقول مخبر کے ان کا منہ صرف سوتے ہوئے رکتا ہے ورنہ چلتا رہتا ہے اور وہ بولتے بھی ہوئے بھی منہ چلاتے رہتے ہیں اس لیے سامنے بیٹھا ہوا ان کی فائرنگ کی زد میں آ جاتا ہے میرا مشورہ ہے اگر اپ ان سے ملنے جائیں تو ایک طرف ہو کر بیٹھے تا کہ سیدھی فائرنگ کی زد میں نہ اجائے۔

جب اپ نے عہدہ سنبھالا تو اس وقت ان کی ٹکر کا ایک اور بندہ ہمارے پاس موجود تھا لیکن انے کے بعد وہ اپنا مقابل دیکھ کر دل کو غم لگا بیٹھا اور دار فانی سے کوچ کر گیا اس کی ناگہانی موت کے بعد اب اس راج دھانی پر اپ کی سلطنت قائم ہو چکی ہے اور قائم رہے گی بلکہ اس میں دن دگنی رات چوگنی ترقی ہوتی جائے گی۔

کانوں کے کچے ہیں اور عقل کے استعمال کو اپنے اوپر ممنوع قرار دے رکھا ہے اس لیے دو تین بندوں سے ان کی بنتی ہے جو اپنے لیے دوسروں محکموں سے لائے ہیں بس ان کی بات سنتے ہیں اور مانتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اب محکمہ ان دو تین بندوں کے

محمد کلیم

ہاتھوں میں یرغمال بن چکا ہے اور ہر شخص دہائی دیتا نظر آتا ہے اور دعا کرتا نظر اتا ہے کہ کب یہ یہاں سے جائیں اور ان کی جان چھوٹے۔

اتنے سست ہیں کہ اٹھ کر اپنا کوئی کام نہیں کرتے ویسے اپس کی بات ہے یہاں تو کوئی بھی نہیں کرتا لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ کام کر لیتا ہے انہوں نے ٹریننگ کے لیے ایک ٹرینر رکھا ہوا ہے جوان کو روز ورزش کرانے آتا ہے اور مزے کی بات یہ ہے انہوں نے کبھی جم جا کر ورزش نہیں کی بلکہ اپنے دفتر میں بیٹھے بیٹھے ورزش کرتے رہتے ہیں کہنے والے کہتے ہیں ٹرینر ورزش نہیں کرواتا بلکہ چمپی مالش کرتا ہے جس سے وہ ایک بار پھر کھانا کھانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

ہر وقت خوفزدہ رہتے ہیں بس اوپر سے کوئی خط آنے کی دیر ہے پورے محکمے کی دوڑیں لگ جاتی ہیں ایک مرتبہ کسی تربیت پر جانا تھا تربیت دو حصوں میں تقسیم تھی پہلے حصے میں کچھ محکموں کی تربیت ہونی تھی دوسرے حصے میں مزید کی۔ تقسیم اس طرح تھی کہ ہمارے محکمے کی باری دوسرے حصے میں آ رہی تھی لیکن اپ نے پہلے حصے میں ہی تربیت کے لیے نامزد لوگوں کو بھیج دیا جب تربیت مکمل ہو گئی تو دوسرے حصے میں بھی نامزد لوگوں کو کہا جا کر حاضری لگا آئیں جبکہ ان کو بتیرہ سمجھایا حاضری لگ چکی ہے تربیت کی وصولی ہو چکی ہے مگر نہیں آپ اڑے رہے اور نامزد امیدواروں نے دوبارہ تربیت حاصل کی (اثر تو کچھ ہونا نہیں تھا)

آپ کی والدہ ہر روز دفتر میں آپ سے ملنے آتیں کیونکہ آپ ان کو ملنے سے ان کے گھر نہیں جاتے تھے کیونکہ گھر والی سے ڈرتے تھے اس لیے دفتر میں ہی آداب فرزندگی انجام دیتے تھے ایک گاڑی بھی والدہ کو دے رکھی تھی (چپ بتانا نہیں) آپ کی بہن بھی دفتر میں ملنے آتیں تھی اور ان کے سارے کمپوزنگ کے کام بھی دفتر کے کمپیوٹر آپریٹر ہی کرتے تھے جس پر اکثر افسر جلیس ناراض بھی ہو جاتے تھے کہ کام ٹھیک نہیں کرتے کام چور۔

آج تک سمجھ نہیں آئی کہ آپ کو سپورٹس کا اتنا شوق کیوں تھا کھیلنے کا نہیں بل کہ دیکھنے کا اس لیے دفتر میں 55 انچ کی ایل ای ڈی لگوائی ہوئی تھی اور انٹرنیٹ کے بہترین کنکشن لگا رکھے تھے تا کہ میچ کی ایک جھلک سے بھی محروم نہ ہو جائیں حالانکہ ان کو چینل بدلنے میں بھی سانس چڑھ جاتا تھا بقول جام صاحب کے جب اپ کوئی کام کر نہیں سکتے تو دیکھ کر ہی دل کو راضی کر لیتے ہیں شاید یہی کام یہاں بھی ہو رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

تحفہ بے بہا

ہائے ارواح میں آج یوم الفصل تھا۔ سارے ''ارواح بچے'' مقابلہ دیکھنے آئے تھے اور تمام جوان مقابلے کے لیے تیار تھے۔ نیز کامیابی کے لیے پرعزم۔

روحوں کے چہرے نہیں ہوتے۔ وہ بولتے ہیں سنتے ہیں لیکن اپنے جذبات کا اظہار نہیں کرتے۔ ان کی دنیا رنگوں سے خالی ہے۔ وہ خوشبو اور ذائقہ جیسی کسی چیز کو نہیں جانتے۔ ان کے پاس رشتے نہیں ہوتے۔ کوئی کسی کا باپ نہیں ہوتا اور کوئی کسی کی ماں نہیں ہوتی۔ وہ جب آنکھ کھولتے ہیں تو دوسرے بچوں کے ساتھ ''میدان آفرینش'' کی جانب چلنے لگتے ہیں۔ جہاں بالغان کے درمیان مقابلہ ہوتا ہے اور ہر بار کوئی ایک ہی اس مقابلے کو جیت پاتا ہے۔ جو سب سے زیادہ طاقتور ہو۔ کبھی کبھار دو یا تین بھی کامیاب ہوتے ہیں لیکن ہر بار نہیں۔ ہر بالغ ہونے والے بچے کو مقررہ وقت پر مقابلے میں شریک ہونا ہوتا ہے۔

مقابلہ شروع ہونے ہی والا تھا۔ ہجوم کے درمیان ایک چھوٹا سا خاموش روح ''عدم'' کھڑا، اس تماشے کو بغور دیکھ رہا تھا۔ ''علیم'' اس کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔ وہ علیم سے پوچھتا ہے کہ: جیتنے والے کہاں جاتے ہیں؟

علیم: ''کوئی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ جیتنے والوں کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ لیکن پرانے ارواح کہا کرتے تھے کہ کامیاب ہونے والے ''ہائے عالم'' میں پہنچ جاتے ہیں۔

وہاں رنگ ہیں، ساز ہیں، ذائقے ہیں اور بے شمار ایسی چیزیں جو ناقابل تصور ہیں، پائی جاتی ہیں۔ وہاں رہنے کا دورانیہ انتہائی طویل ہے۔ کئی کھرب سیکنڈز۔ وہاں کے لوگوں کے پاس چہرے ہوتے ہیں۔ جو ہنستے ہیں، مسکراتے ہیں، غمگین ہوتے ہیں، اور خوش ہوتے ہیں۔ وہاں لوگ رشتوں اور تعلقات کی بدولت ایک دوسرے سے جڑے رہتے ہیں۔

کیا پتا یہ بات سچ ہے یا نہیں''

''لیکن علیم! جو مقابلہ ہار جاتے ہیں ان کے ساتھ کیا ہوتا ہے؟''

''وہ واپسی کے راستے میں ہی ختم ہو جاتے ہیں۔''

''کیا ہمارے ساتھ بھی ایسا ہوگا؟''

''میں نہیں جانتا، یہ تو وقت آنے پر ہی معلوم ہو سکتا ہے''

وقت نہ رکا۔ عدم بالغ ہو چکا۔ تمام جوان مقابلے کے لیے تیار تھے۔ علیم بھی اسی صف میں کھڑا تھا۔ عدم کو بے حد خوف تھا کہ اگر وہ کامیاب نہ ہوا تو کیا ہوگا۔ لیکن اس نے خود کو حوصلہ دیا کہ وہ ضرور کامیاب ہوگا۔ مقابلہ شروع ہوا۔ جوانان مختلف مشکلات کو عبور کرتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ راستے نہایت پیچیدہ اور گمراہ کن تھے۔ بالآخر انھیں اپنے سامنے مقابلے کا اختتامی مقام ''باب الفصل'' نظر آنے لگا۔

وہ جی جان سے دوڑے۔ لیکن علیم اور عدم کے سامنے ایک تگڑا نوجوان سارے لشکر کو پیچھے چھوڑتے ہوئے ''باب الفصل'' میں داخل ہو گیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے باب الفصل بند ہو گیا۔ سارے جوان رک گئے اور سکتے میں آ گئے۔ آگے کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ واپسی کا راستہ موت کا تھا۔ عدم نے ڈھونڈا: ''علیم کہاں ہے؟'' وہ آگے والوں میں تھا اور لوٹ رہا تھا۔ عدم شدید مایوس ہو گیا اور علیم سے پوچھا: ''اب کیا ہوگا''

علیم: ''کھیل ختم ہو چکا''

عدم: ''کیا اب میں مر جاؤں گا؟''

علیم: ''نہیں! تم نہیں مرو گے تم کبھی پیدا ہی نہیں ہوئے''۔

☆☆☆☆☆

محمد اویس

زہرِ حیات [مائیکرو فکشن]

''پتا نہیں بڑھیا! تو کب مرے گی اور تجھ سے کب میری جان چھوٹے گی؟ اور وہ بھی ایسا کاٹھ کا الو ہے کہ ہزار بار کہنے پہ بھی تجھے اولڈ ایج ہوم میں پھینک کر نہیں آتا ہے۔'' جمیلہ اپنی بوڑھی ساس پر بری طرح چلائی تھی۔

''مجھ کمزور بوڑھی عورت پر اتنا ظلم مت کر جمیلہ! خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ اور جسے تو کاٹھ کا الو کہہ رہی ہے، وہ میری سنتا ہی کب ہے۔ اسے بھی تم رو رو کر رام کر لیتی ہو۔'' اس کی ساس درد بھرے لہجے میں بولی۔

''بہت زبان چلتی ہے تیری بڑھیا! رک ذرا! ابھی تیرا علاج کرتی ہوں۔ تو نے جو میری ناک میں دم کر رکھا ہے، اس سے تو آج میری جاں بخشی ہو۔'' جمیلہ غصے سے چلاتی ہوئی اپنی ساس پر پل پڑی۔ اس کی بوڑھی ساس بھی کمزور جسم کے ساتھ اپنا دفاع کرتی رہی۔ لیکن ایک کمزور جسم کا ایک توانا جسم سے کیا مقابلہ!

جمیلہ نے اب کی بار جو زوردار طریقے سے اپنی ساس کو جھٹکا دیا تو وہ لہراتی ہوئی دیوار سے جا ٹکرائی۔ اس کا سر ایک دھماکے سے دیوار سے ٹکرایا۔ اس کے بعد جمیلہ کی ساس لہراتی ہوئی زمین کی جانب آئی اور گرتے ہوئے اس کا سر میز کے کونے سے ٹکرا گیا۔ اور تیزی سے بہتا خون اس بوڑھی عورت کا چہرہ رنگین کرتا چلا گیا۔ اس سے پہلے کہ جمیلہ اس افتاد پر سنبھل پاتی۔ اسی لمحے دروازہ کھلا اور جمیلہ کا شوہر حیدر اندر داخل ہوا۔ اور ایک لمحے میں تمام ماجرا روزِ روشن کی طرح اس پر عیاں ہوتا چلا گیا۔

''تم، تم ذلیل عورت! آج تک مجھ سے جھوٹ بولتی رہی۔ میں نے کبھی بھی اپنی ماں کی باتوں پر اعتبار نہیں کیا۔ تم میری شریکِ حیات نہیں بلکہ زہرِ حیات ہو۔ جس نے دنیا کے ساتھ ساتھ میری آخرت بھی برباد کر ڈالی ہے۔ اچھا ہوا! اللہ نے مجھے تم سے اولاد نہیں دی۔'' حیدر چلا اٹھا۔

پھر جمیلہ کو فارغ کر کے اپنی ماں کو بازوؤں میں تھامے ہسپتال کی جانب بھاگ گیا۔ جبکہ جمیلہ اپنی جگہ پر پتھرائی سی کھڑی رہ گئی۔

☆☆☆☆☆

بابر امین ابر

ہمارا گھر

صفدر صدیق رضی

اے پسر

جانِ پدر

جس گھر میں ہم سب رہ رہے ہیں

اپنے آباء کا نہیں

اس کے در و دیوار پر

سیمنٹ اور بجری کی چھت کا بوجھ ہے

یونہی نظر آتا ہے

ہم سب کو یہی لگتا ہے

لیکن جانِ من ایسا نہیں

اس گھر کے جتنے بھی در و دیوار ہیں

سارے

تمہاری مادرِ مرحوم کے

زیور کے زیرِ بار ہیں

مقتدر اشرافیہ مبارک ہو!

ابھی کیچڑ سے بھری
گلیوں میں رہنے والے
بھوکے ننگے
بے خبر لوگوں کو
ننگی حقیقت کا ادراک نہیں ہے
وہ صورت حالات کو اپنا مقدر جانتے ہیں
اور اپنی قسمت پر شاکر ہیں
تمہارے دیئے ہوئے فلسفے پر
عمل پیرا وہ لوگ
صبر اور دعا پر یقین رکھتے ہیں
وہ نہیں جانتے کہ انسان
اپنا مقدر خود تعمیر کرتا ہے
وہ یہ بھی نہیں جانتے
کہ تمھارے شیش محلوں میں
اور لامحدود دولت میں
ان کی محنت کا کتنا خون شامل ہے
ان کی یہ بے خبری اور کج فہمی
اے مقتدر اشرافیہ!
تجھے مبارک ہو!!

منظور ثاقب

نظم

ثار ترابی کے لیے

بے بصر عہد میں یہ کر کے دکھانے والا
اب تو یہ شہرِ ادب میں ہے حوالہ اُس کا

حرمتِ شعر لہو دے کے بچانے والا
گونگے الفاظ کو آواز بنانے والا

ایسے میں جب کہ کوئی فن کا مددگار نہ تھا
کون ہے اُس کے سوا کوئی نہیں کوئی نہیں

دشت و صحرا کو سخن زار بنانے والا
ہو بہ ہو شعر کو تصویر میں لانے والا

وہ خُرابی ہے درِ علم کُھلا ہے اُس پر
مادرِ علم سے لیتا ہے دعائیں قاسم

علم کے شہر سے ہے فیض اٹھانے والا
ہو گا شرمندہ اُسے نیچا دکھانے والا

جاوید قاسم

سالِ نو مبارک ہو

یہ مفلسی مٹا دے نیا سال دوستو
تم کو غنی بنائے نیا سال دوستو

تب دل لگے مناتے ہوئے جشنِ سالِ نو
کچھ گل نئے کھلائے نیا سال دوستو

سب کچھ وہی پرانا پرانا سا دیکھ کر
کیسے کوئی منائے نیا سال دوستو

خواہش ہے سب کی آنکھ کے اشکوں کو پونچھ کر
لب پر ہنسی سجائے نیا سال دوستو

دنیا میں کاش پیار محبت کے ہر طرف
منظر ہمیں دکھائے نیا سال دوستو

اللہ سے کرو یہ دعائیں کہ میرے بھی
شانے پہ چاند اگائے نیا سال دوستو

ہر ایک سکھ جہاں کا تمہارا بنے نصیب
یوں تم کو راس آئے نیا سال دوستو

ذکی طارق

کوئی آئے برس یہ کہتا ہے

کوئی آئے برس یہ کہتا ہے
وہ خواب مجھے واپس کر دو
جو نصف صدی سے بے تعبیری کے بے
نام سفر میں ہیں
وہ آنکھیں،
جو تم مانگ کے لائے تھے اپنے چہرے کے لیے
کب دو گے؟
جب وہ پتھر کی ہو جائیں گی!

وہ جذبے،
جو سینوں کو مشعل رکھتے تھے
تم جانے کون سے برف سے ڈھکے
پہاڑوں میں چھوڑ آئے ہو

وہ بازو،
دنیا، جن میں سمٹ آیا کرتی تھی
میں نے تمھیں دے ڈالے تھے
اب کہاں ہیں وہ؟

وہ خون آلود قبا میری،
تم پہن کے جس کو نکلے تھے
ایثار و عمل کے رستے پر
لوٹا بھی دو!
کہ اس سے پھوٹتی میرے لہو کی خوشبو پر
برسوں کے پسینے اور تعفن کا قبضہ ہے

وہ آئے برس یہ کہتا ہے
میں آئے برس یہ سوچتا ہوں
اب کہاں سے لاؤں اس کی وہ آنکھیں
وہ خواب،
وہ جذبے،
وہ بازو،
وہ خون آلود قبا
کہ میں، خود بھی تو اس کی طرح
بے چہرہ ہوں،
بے بدن ہوں اب

محمد انیس انصاری

تحفہ

ایک مدت ہوئی
میرا ساجن مجھے
ملنے آیا نہیں
بیتنے کو چلی
برکھا رُت بھی چلی
اور جیون کے سائے
بھی ڈھلنے لگے
رہگزر کے نشاں
اب تو مٹنے لگے
گھر کی ویرانیاں
بن گئی وحشتیں
دے رہا ہے دیا
اب تو لو آخری
بانٹنا تھا جسے
میرے اندر کا دکھ
میرے زخموں پہ مرہم
لگاتا تھا جو
وہ تو آیا نہیں
وہ تو آیا نہیں
میں نے پچھلے برس
گاؤں کے میلہ سے
ایک کنگن خریدا تھا اس کے لیے
اور تحفے میں
دینا تھا اس کو مگر
وہ تو آیا نہیں
وہ تو آیا نہیں

سوال

کون سنے گا
بات ہماری
کس سے من کی
بات کہیں
چپ چپ اپنا
جیون سارا
تنہائی کی لمبی راتیں
کاٹ سکیں گے کیسے
پورا شہر ہی گھر لگتا ہے
شام کو طاہر ڈر لگتا ہے

سید طاہر شیرازی

ہجر موت کا فرشتہ

ہے تعاقب میں میرے صدیوں سے
چاپ کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا
اک دھواں پیشِ منظرِ ہستی
ایک آنسو پلک میں جلتا ہوا
میں کہیں سے کہیں چلی جاؤں
صورتِ مہر و ماہ پھر ابھرے
پھر وہی درد دل میں پلتا ہوا
ہے تعاقب میں کتنی صدیوں سے
چاپ کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا

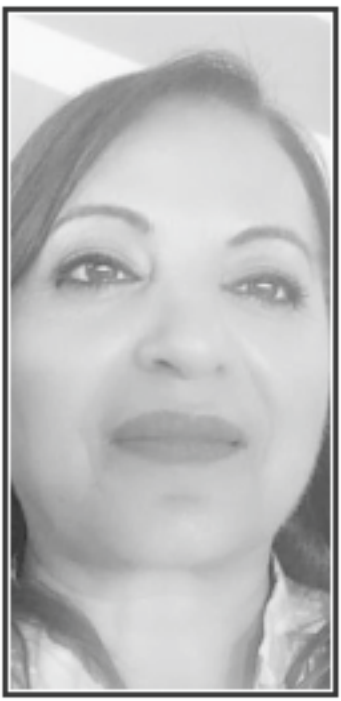

رخشندہ نوید

اِسے چھوڑ دو

مرے ہاتھ کو تم نے تھاما ہوا ہے
مرے ہاتھ کو زور سے تم نے ہاتھوں میں تھاما ہوا ہے
''اسے چھوڑ دو''
اسے چھوڑ دو
میں چلی جاؤں گی
میں چلی جاؤں گی
جیسے آنکھوں سے جاتے ہیں آنسو
میں چلی جاؤں گی
جیسے راتوں سے جاتے ہیں جگنو
میں چلی جاؤں گی
پھر کبھی لوٹ کر میں نہیں آؤں گی
مرے ہاتھ کو چھوڑ دو
مرے ہاتھ کو
تم نے تھاما ہوا ہے

موت آب حیات ہے زندگی گویا سراب

ہم زندگی جینے کی خواہش میں
مٹی ہو جائے گا

اپنا دل رہن رکھے بیٹھے ہیں
زندگی غم سے مقسوم تھی

دکھوں کی پوٹلیاں ڈھوتے ڈھوتے
ہم نے گھونٹ گھونٹ موت کا ذائقہ چکھا ہے

احساس شل ہو گیا ہے

جذبے مردہ
جہاں ہم ہیں وہاں

بے دل وجود
موت آب حیات ہے زندگی سراب"

دنیاداری کے بوجھ تلے دبا

زندگی جینے کا تاوان ادا کرتے کرتے

نائلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

میرے ہونٹوں پہ ہے سب کے دل کی
ڈھونڈیئے اپنے ہی اندر مجھ کو

کشمیر آشوب

آگ کے شعلوں کا منظر، آئنہ کشمیر کا
خون کے دریا میں ڈوبا مسئلہ کشمیر کا

اس زمیں پر جنت الفردوس کی تصویر ہے
بن کے دوزخ رہ گیا ہر راستہ کشمیر کا

انجمن اقوام کے کردار کی کیا بات ہے
مسخ کر کے رکھ دیا ہے زائچہ کشمیر کا

ہیں شہیدوں غازیوں کی مائیں کتنی اشکبار
اے خدا کس روز ہو گا تصفیہ کشمیر کا

عالمی انصاف کے داعی کہاں مرکھپ گئے
بن گیا ناسور اب تو آبلہ کشمیر کا

ہے بقولِ قائدِاعظمؒ ، یہ اپنی شاہ رگ
اس حوالے میں ہے مضمر فیصلہ کشمیر کا

اُمتِ مرحوم کی تقدیر کا ہے ترجماں
ہو غزہ کا تجزیہ یا تجربہ کشمیر کا

عالمِ اسلام کی یہ بے حسی ، مُردہ دلی
کس طرح کر پائے گی سر معرکہ کشمیر کا

منزلِ آزادی کی ہے ، قربانیوں کی مقتضی
بڑھ رہا ہے دھیرے دھیرے قافلہ کشمیر کا

ظلم سہہ کر بھی ڈٹا ہے قاتلوں کے سامنے
مرحبا فیضان عزم و حوصلہ کشمیر کا

فیض رسول فیضان

کشمیر کا نوحہ

ہے زرد فلک چاند ستاروں میں لہو ہے
کشمیر کی جھیلوں میں چناروں میں لہو ہے

نہلائے گئے خون میں وہ سرو صنوبر
گل رنگ فضاؤں میں بہاروں میں لہو ہے

منہ سے بھلے اب بولے نہ بولے مرا دشمن
میں جانتا ہوں خفیہ اشاروں میں لہو ہے

آنکھوں سے ٹپکتا ہو تو پھر لگتا ہے فیصل
سڑکوں پہ لہو راہ گذاروں میں لہو ہے

فیصل زمان چشتی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جسم تقدیر کی زنجیر پہن کر خالد
روح کا بوجھ سنبھالے کہ اُٹھائے سائے

ویلنٹائن ڈے

حسنِ کامل کو کہا، لوگوں نے کیوں کر ماہتاب
اپنے اندر، داغ جو رکھتا ہے گہرے بے حساب

عشق کی ہر بات عمدہ، عشق کا ہر کام خوب
عشق سے دنیا میں رونق، عشق سے یہ آب و تاب

عشق ارفع، عشق اعلیٰ، عشق کارِ پاک وصاف
عشق، آداب طریقت، زندگانی کا نصاب

عشق بخشے، بندۂ عاجز کو شہرت، در جہاں
عشق ہی کرتا ہے جگ میں کامران و کامیاب

عشق وہ انمول گوہر، جس کے دیوانے سبھی
عشق وہ بے مثل شے، جس کا نہیں کوئی جواب

عشق ہی کے نور سے روشن ہیں اذہان و قلوب
عشق ہی کی یادگاریں، بے ستوں، صحرا، چناب

درحقیقت، عشق ہے سود و زیاں سے ماورا
کر دیا، ہر بوالہوس نے، اس کو پابندِ گلاب

شوکت محمود شوکت

مٹی کا فتور

کہانی میں
کوئی کردار نہ تھا
وسیع کینوس سے
منظر غائب
جیسے دھویں کے بادل
ریت پر اجنبی پیروں کے نشاں
باغ میں
درختوں کی جڑوں میں چھپے راز
کہاں سوئے پڑے تھے؟

وہ اخبار
جسے خبر کا چہرہ
دُنیا کو دکھانا تھا
لفظوں سے کالک ملنے لگا
جھوٹ کے زہر سے
قاری مر گیا
خود پسندی کے جرثومے
بیزاری کے تعفن سے آلودہ
خودغرضی کے مینار تعمیر کرنے لگے
سچ
(برائے نام)

سقراط کی یاد میں
تعزیتی ریفرنس کا انعقاد نہ کر سکا
وقت کے تاریک لمحوں میں
رات کے بستر سے
صبح کا اشارہ ملا ہے
شاید
انسانیت کا بازار کھُل جائے
محبت کا سورج نکلے
اُمید سے زندگی
معنی کے لشکر میں شامل ہو جائے
مگر یہ
خوش فہمی کی عالمی زبان ہے
جس کا مترجم کوئی نہیں!!

امجد بابر

تم سے کہنا تھا

وسیم جبران

اے بچھڑنے والے سُن !

جب کبھی ضرورت ہو

تجھ کو بھی سہارے کی

زندگی کی راہوں میں

جب حسین چہرے کی

روشنی پڑے مدھم

ڈر لگے اکیلے میں

تجھ کو اپنے سائے سے

جب تمہاری نیندوں سے

خواب روٹھ جائیں سب

تم پکارنا مجھ کو

میں وہیں ملوں گا بس

''دیوانے کا خواب''

کون ابھی تک تھام سکا ہے
دیوانے کا ہاتھ
دیوانے کے ہاتھ میں پتھر
پتھر تیرا دل
تیرے دل میں
پتھر سے
پھوٹے گا چشمہ
اس آواز میں شامل ہوگی
دیوانے کی بات

دیوانے کا خواب
دور افق کے پار
دور افق کے پار ہے پھیلی
پشمینے کی شال
پشمینے کی شال میں شامل
ہے سارا سنگسار
اوڑھ لے اس کا خواب

دیوانے کے کندھے پر ہے
گٹھڑی قسمت کی
دیوانے کے ہاتھ میں ہے اک
جلتا ست چراغ

اس کا کہنا مان
چل دے اس کے ساتھ

دور افق پر
جلتا سورج
آنکھ سے اوجھل ہو جائے جب
تب دیکھیں گے
دیوانے کا رقص
دیوانے کے رقص میں شامل
تیرے جلتے ہونٹ
ان جلتے ہونٹوں سے کر دو
دیوانے کو رام
ہو گئی گہری شام

زاہد خان

ماں

دھوپ میں ہے جو سائباں کی طرح
کون سایا کرے گا ماں کی طرح
مجھ سے غافل نہیں کبھی ہوتی
سر پہ رہتی ہے آسماں کی طرح

اس قدر چارہ گر دکھاؤ تو
ڈھونڈ کر کوئی ایسا لاؤ تو

کیا بتاؤں تجھے کہ کیا ہے ماں
جگمگاتی ہوئی ضیا ہے ماں
جس سے روشن ہیں گھر کے بام و در
ظلمتِ شب میں وہ دیا ہے ماں

اس کا پیکر خدا کا مظہر ہے
دیکھنا اس کو حجِ اکبر ہے

میرا کتنا خیال رکھتی ہے
وہ خبر بھی کمال رکھتی ہے
اس کا پایا نہیں کوئی ہمسر
آپ اپنی مثال رکھتی ہے

زندگی کی بہار تم سے ہے
میرے دل کو قرار تم سے ہے
اور کب ہے کسی بھی رشتے سے
جو محبت جو پیار تم سے ہے

دو جہاں کا بھلا تری خدمت
ہے خدا کی رضا تری خدمت

نامکمل ہے گفتگو میری
پھر بھی قائم ہے آبرو میری
تیرے دم سے ہی بہہ رہی ہے یہ
زندگانی کی آبجو میری

قابلِ ناز ہے تری ہستی
میرا اعزاز ہے تری ہستی

سوئے حق سے سلام ملتے ہیں
عظمتوں کے پیام ملتے ہیں
تیری تعظیم کی بدولت ہی
اولیا کو مقام ملتے ہیں

ماں ترا احترام کرتا ہوں
تجھ کو جھک کر سلام کرتا ہوں

زبیر خیالی

رنگ اور خوشبُو

رنگ اور خوشبُو ہی سہی گر نہ ملے گُل
کہ ہم گداؤں نے کبھی
دل کے ساغر کو
لب تا لب بھرنے کی
سوچی ہی نہیں
کہ ہم گداؤں نے کبھی
ترے پانے کا تصور نہ کیا
مگر
ترے پانے کی حسرت رہی
کہ ہم گداؤں کو کوئی
رنج نہیں
کوئی غم نہیں
بس اِک کسک سی ہے
جو کبھی کبھی دل کے
گرد تہذیب سے آلودہ
خانۂ ویراں میں
اِک ہلچل سی مچا دیتی ہے
جو کبھی وہ رنگ اور خوشبُو
پھرتے ہیں آوارہ بادلوں کی طرح
سوچ فلک پر
تو دل تڑپتا ہے
تو دل روتا ہے
مگر
میں
میں وہیں رہتا ہوں
پھر یہی سوچتا ہوں
کہ رنگ اور خوشبُو ہی سہی

ظہور احمد مخلص

عشق و اسود
رفعت انجم

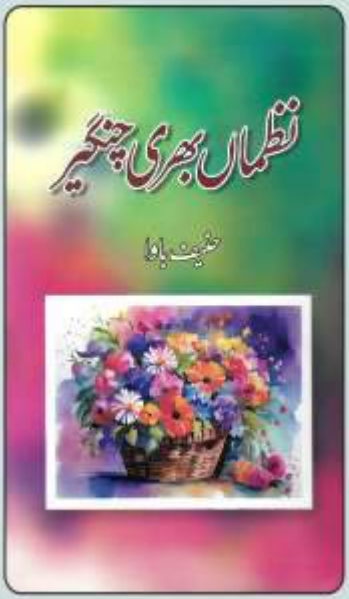
نظماں بھری چنگیر
حنیف باوا

تیرے آنے کا انتظار رہا

اَبگینی
خوابوں
کی
شگفتہ نعیم بائی

محترمہ سائرہ ہاشمی، جناب احمد ندیم قاسمی، جناب خالد احمد، جناب خالد یزدانی، جناب اعجاز رضوی، جناب اسرار وڑائچ، جناب محمد حنیف، جناب امیر حسین جعفری اور جناب عون الحسن غازی

جناب مرزا حامد بیگ، جناب حامد یزدانی، جناب خالد احمد اور جناب زاہد مسعود